جلد ۳۵
عدد ۷

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

اپریل ۱۹۵۱ء

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۵	اپریل ۱۹۷۱ء - صفر، ۱۳۹۱ھ	عدد ۲

مغربی پاکستان — مشرقی پاکستان

چندہ سالانہ : آٹھ روپے — ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور — ہوائی ڈاک

فی پرچہ : ۸۰ پیسے — ۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور — فی پرچہ ۹۰ پیسے - سالانہ ۱۰ روپے

عام ڈاک سے ۸۰ پیسے ، ۸ روپے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اس مرتبہ ترجمان القرآن میں "تفہیم القرآن" کا حصہ شائع نہیں ہو رہا اس کی وجہ، جیسا کہ احباب کو معلوم ہی ہے، محترم مولانا مودودی کی علالت ہے۔ شافیِ مطلق کے حضور میں دعا ہے کہ وہ مولانا کو جلد از جلد مکمل طور پر صحت یاب فرمائے تاکہ وہ دینی امور و مشاغل کی انجام دہی میں حسبِ معمول منہمک ہو سکیں۔ اُن کی علالت پاکستان کے دینی حلقوں کے لیے ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام کے لیے سخت وجہِ اضطراب ہے۔ خصوصاً موجودہ پریشان کن حالات میں اسلامی محاذ پر ان کی سخت ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اور جو لوگ اس محاذ پر کام کر رہے ہیں وہ ہر قدم پر اپنے آپ کو ان کی رہنمائی کے محتاج پاتے ہیں۔ ترجمان القرآن کے قارئین سے درخواست ہے کہ وہ مولانا کی صحت یابی کے لیے دُعا فرمائیں۔

اس وقت ملک جس شدید بحران سے گذر رہا ہے یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں جو اچانک ملک میں رُونما ہو گیا ہے بلکہ یہ فطری نتیجہ ہے اُن غیر اسلامی رجحانات اور قوتوں کا جو اس ملک میں عرصہ دراز سے کام کر رہی ہیں۔ یہ وقت اب کسی کو کوسنے یا ایک دوسرے پر الزام لگانے کا نہیں بلکہ اس امر کا جائزہ لینے کا ہے کہ وہ کونسے اسباب اور کوتاہیاں تھیں جن کی وجہ سے ملک اس مصیبت میں گرفتار ہوا ہے۔ یہ قائدین جنہیں اس وقت موردِ الزام ٹھہرایا جا رہا ہے یا جن کی بے تدبیری اور ہٹ دھرمی کو ان دگرگوں حالات کا ذمہ دار قرار دیا جا رہا ہے۔ اُنہیں خود انہی غلط رجحانات کے ریلے نے اُبھارا ہے۔ اگر

ملک صحیح راہ پر گامزن ہوتا تو پھر اُن کے اُبھرنے کے کوئی امکانات نہ تھے۔ اس وقت اس ملک کو ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام کو دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک انابت الی اللہ اور دوسرے تدبیر و تفکر اور حالات کی صحیح سمجھ بوجھ اور تعمیری کام کے لیے پختہ عزم۔

اگر تاریخ کا اپنے آپ کو دُہرانا ایک مسلّمہ حقیقت ہے تو پھر اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم آج حوادث کے اُسی دَور میں سے گذر رہے ہیں جو خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے وقت مسلمانوں کو پیش آئے۔ اس خلافت میں لاکھ خامیاں سہی مگر یہ بات تو اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس سے مسلمانوں کے اندر یہ احساس تو کسی نہ کسی طرح قائم تھا کہ ان کی شیرازہ بندی خاک و خون کے رشتوں سے نہیں ہوئی بلکہ خالص روحانی بنیادوں پر ہوئی ہے۔ اس احساس کے یُوں تو متعدد فوائد تھے مگر تین خاص طور پر نمایاں ہیں: ایک یہ کہ مسلمان خواہ کسی ملک، قبیلے، رنگ اور نسل سے تعلق رکھتا تھا مگر اُس کے اندر اس خلافت کی وجہ سے یہ احساس پُوری طرح موجود رہتا تھا کہ وہ چونکہ ایک بین الاقوامی برادری کا رُکن ہے اس لیے اُسے وطنی اور نسلی مفادات سے بلند تر ہو کر سوچنا چاہیے۔ گذشتہ دو تین سو سال میں وہ کونسی ایسی اُفتاد ہے جو مسلمانوں پر نہیں پڑی۔ مغربی قوموں نے انہیں غلام بنایا، انہیں دنیا میں ذلیل و خوار کیا، ان کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لُوٹا، ان پر ناقابلِ بیان مظالم ڈھائے مگر ان سارے مصائب کو مسلمانوں نے یک جان ہو کر برداشت کیا اور ایک خطّۂ ارضی میں رہنے والے خدا کے بندوں نے اپنے دکھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے دوسرے ممالک میں بسنے والے اپنے بھائیوں کی پریشانیوں کو زیادہ شدّت سے محسوس کیا اور انھیں اپنے محدود وسائل کی حد تک دُور کرنے کی کوشش کی۔ انہیں اپنی مظلومیت سے کہیں زیادہ اپنے بھائیوں کی مظلومیت کی فکر دامنگیر رہتی تھی۔ اس حدیث کی مکمل تصویر نہ سہی مگر ایک حد تک مسلمانوں کے اس احساس کو دیکھتے ہوئے اس صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ضرور سامنے آجاتا ہے کہ یہ اُمّت جسدِ واحد کی مانند ہے جس کے اگر کسی عضو کو بھی تکلیف ہو تو پُورا جسم ایک کرب محسوس کرتا ہے۔

اس احساس کا دوسرا فائدہ یہ تھا کہ جس دین کی بدولت اُنہیں ایک بین الاقوامی برادری بننے کا شرف حاصل ہوا ہے وہ اس کے بارے میں حد درجہ محتاط اور حساس رہنے اور اس پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے دیتے کیونکہ وہ بالکل صحیح طور پر سمجھتے تھے کہ اُن کی اجتماعی زندگی صرف اس دین کی رہینِ منت ہے۔ اگر اس میں کوئی ضعف پیدا ہو گیا تو ان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ چنانچہ اس ملت کے بہی خواہ ہمیشہ اس بات کا اہتمام کرتے رہے کہ مسلم قوم کا اس دین سے تعلق بڑا گہرا ہو اور دنیا کے سارے مسلمان صبغۃ اللہ میں رنگ جائیں۔ اس غرض کے لیے مختلف دینی تحریکات مختلف طبقات اور مختلف حلقوں میں برابر سرگرم عمل رہتیں۔ وہ ایک طرف تو مسلمانوں کے اندر دین کی شمع روشن رکھنے کی کوشش کرتیں اور دوسری طرف اس بات کا بھی خاص طور پر خیال رکھتیں کہ الحاد اور بے دینی کی تاریکیاں ان پر یلغار کر کے کہیں اُن کی زندگیوں کو تاریک نہ بنا دیں چنانچہ جاہلیت کی اُن تاریکیوں سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے اس ملت کے خیر خواہوں نے ہر میدان میں بھرپور کوششیں کیں۔ یہ غالباً اُن پاکباز لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ دو تین سو سال کی غلامی کے بعد بھی مسلمانوں کا اسلام سے کسی نہ کسی طرح تعلق باقی ہے۔ اور ان کی معاشرتی زندگی میں اس کے واضح اثرات دکھائی دیتے ہیں۔

تیسرے اسلام سے وابستگی کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر کوئی ایسی قیادت اُبھرنے کی جرأت نہ کر سکتی تھی جو دینِ حق کے ماسوا کسی نظامِ باطل کی علمبردار ہو۔ مسلمان ایک چیز ہی جانتے تھے کہ سو فیصد حق اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اس کی مخلصانہ پیروی سے اُن کی دنیوی اور اُخروی فلاح وابستہ ہے۔ یہی اُن کی قوت کا واحد سرچشمہ اور ان کے سارے دکھوں کا مداوا ہے۔ اس لیے اُنہیں اصلاحِ احوال کے لیے صرف اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس دین کے مقابلے میں ان کی نظر میں ہر چیز ہیچ بلکہ فضول تھی۔ یہ بات کبھی ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آسکتی تھی کہ اس دین کو چھوڑ کر وہ کبھی خیر اور بھلائی کی راہ پا سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کسی شخص کو یہ ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ اسلام کے علاوہ کسی دوسرے نعرے پر مسلمانوں کو اپنے گرد جمع کر سکے۔ جو فرد بھی اس ملت کی محبت کا دم بھرتا اسے سب سے پہلے یہ ثابت کرنا پڑتا

کہ اس کا دل اسلام کی محبت سے معمور ہے اور وہ فکر و نگاہ اور سیرت و کردار کے اعتبار سے مسلمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری پوری تاریخ میں مسلم قیادت ایک خاص دینی مزاج اور اخلاقی معیار کی حامل رہی ہے۔ دوسرے ممالک کو چھوڑ دیجیے خود اس برصغیر پاک و ہند میں دیکھیے کہ مسلمانوں کے اندر گذشتہ دو سو سال میں کس قسم کی قیادت اُبھرتی رہی۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان جس کے ہاتھ میں ایک طویل مدت تک مسلمانوں کی سربراہی کا منصب رہا اُس کی دینی خدمت سے کون مسلمان ناواقف ہے اُس کی مساعی نے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد بریلویؒ جیسے مجاہدینِ اسلام کو پیدا کیا۔ دیوبند، ندوہ، علی گڑھ بھی احیائے اسلام کی کوششوں کے مختلف مظاہر ہیں۔ تحریکِ خلافت نے محمد علی جوہرؒ، ظفر علیؒ اور اسی طرح کے دوسرے انگریزی تعلیم یافتہ مسٹروں کو مولانا بنا دیا۔ اقبال مرحوم اور قائد اعظم اسلام سے تعلق کی وجہ سے مسلمانوں میں مقبول ہوئے اور اسی نسبت کی بنا پر پوری قوم نے نہ صرف انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا بلکہ اُن کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اُن کے ساتھ جدوجہد میں شریک ہوئے۔

اسے مسلم قوم کی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ خلافت کی قبا چاک ہونے کے ساتھ ہی مسلمانوں کے اندر ایک بین الاقوامی برادری سے تعلق رکھنے کا احساس آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا اور انھوں نے بھی مغربی اقوام کی پیروی میں وطن، زبان اور نسل کو اپنی قومیت کی بنیاد سمجھ کر مادی اور وطنی مفادات کو اسلامی روابط پر ترجیح دینا شروع کیا۔ اور اس طرح ملتِ اسلامیہ چھوٹی چھوٹی قومیتوں میں بٹ کر رہ گئی۔

ان نئی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کے لیے صرف یہی بات کافی نہ تھی کہ ایک خطۂ ارضی کے رہنے والے مسلمان اپنے اپنے ملک کے اندر سمٹ کر بیٹھ جائیں اور وہاں اسلام کے تقاضوں کو کسی نہ کسی طور پورا کرتے رہیں بلکہ اس نئی قومیت کے مطالبات کو پورا کرنے کے لیے انہیں اپنے اندر وہ سارے منفی جذبات پالنے پڑے جو مغرب کی جارحانہ قوم پرستی کے لیے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ ذیل میں ہم اُن کی مختصر الفاظ میں نشاندہی کرتے ہیں۔

انسان جس سرزمین میں پیدا ہوتا ہے اُس سے اُسے بالکل فطری طور پر محبت ہوتی ہے ایک مسلمان

بھی اس جذبہ سے محروم نہیں ہو سکتا مگر نئی قومیت نے وطن کی محبت کے بجائے وطن کی پرستش کا پرچار کیا اور خاکِ وطن سے اُس طرح کا تعلق پیدا کرنے کی تلقین کی جس طرح کہ کوئی خدا پرست اپنے معبودِ حقیقی سے پیدا کرتا ہے۔ اس سے ایک تو انسان زندگی کی اعلیٰ اور ارفع قدروں سے بیگانہ ہوتے کیونکہ وطن اور اہلِ وطن کے مادی مفادات ان کے لیے دنیا کی ہر چیز سے عزیز تر قرار پاتے۔ دوسرے انھوں نے پوری انسانیت سے کٹ کر ایک محدود دائرے کے اندر رہنا اور اس کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ اُس طرح ان کے اندر تنگ نظری اور تعصب پیدا ہوا۔ ان کے نزدیک انسان کہلانے کے صرف وہی لوگ مستحق تھے جو اُن کے ملک کی چار دیواری کے اندر رہنے والے تھے باقی انسان اُن کی نگاہ میں انسانیت کے شرف سے یکسر محروم تھے۔ اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے ہر ملک کے بسنے والوں نے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل اس نہج پر کی جس سے اس قسم کے منفی جذبات کو تقویت حاصل ہو۔ نظامِ تعلیم بھی اسی مقصد کو سامنے رکھ کر مرتب کیا جانے لگا۔ مختلف ممالک میں دستور و آئین کے جو ڈھانچے تیار ہوتے وہ بھی ہر قوم نے اپنے مخصوص قومی مفادات کے پیشِ نظر تیار کیے۔ الغرض دنیا میں کسی ایک جگہ بھی انسانوں کا کوئی ایسا گروہ موجود نہ رہا جنہیں انسانیت اور اُس کے وسیع تر مفادات سے محبت ہو۔ پوری دُنیا تعصبات سے بھر گئی۔

ان منفی جذبات کے اندر زیادہ زور اور توانائی پیدا کرنے کے لیے یہ بات ضروری تھی کہ دُنیا کی ہر قوم دوسری اقوام کے خلاف پوری شدت سے نفرت کی آگ بھڑکاتے کیونکہ اس نفرت ہی سے اس کے اندر اتفاق و اتحاد کی راہ ہموار ہو سکتی تھی۔ اسی غرض کے لیے سب سے آسان طریقہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو مظلوم اور دوسری قوموں کو ظالم ثابت کیا جاتا۔ کسی مظلوم قوم کو تو خیر یہ حق ہے کہ وہ ظالم قوم کی ظلم و زیادتی کے خلاف آواز بلند کرے اور اپنے عوام کے اندر یہ احساس پیدا کرے کہ انھیں اس سے نجات ملنی چاہیے مگر جارحانہ قوم پرستی کے اس جنون نے قوموں کے اخلاق کو اس حد تک تباہ کر دیا ہے کہ ظالم قومیں بھی بڑی بے شرمی کے ساتھ اپنے مظلوم ہونے کی دہائی دیتی ہیں اور بالحقیقت جو قومیں ظلم کا شکار ہو رہی ہیں اُن کی طرف بعض جھوٹی باتیں منسوب کر کے ان کی چیرہ دستیوں کے افسانے

گھڑ کر انہیں پہلے تو بدنام کرتی ہیں اور پھر ان جھوٹے اور بے بنیاد الزامات کی آڑ لے کر ان پر دستِ ظلم دراز کرنے لگتی ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ کسی قوم کے اندر اس قسم کے غلط رجحانات اخلاقی احساس رکھنے والے اور انسانیت کے بہی خواہ تو نہیں پھیلا سکتے۔ اس منفی کام کی انجام دہی کے لیے وہی لوگ زیادہ موزوں ہو سکتے ہیں جو متعصب، تنگ نظر اور پرلے درجے کے حریص ہوں، جو عوام کے جذبات سے کھیلنے میں بڑی مہارت اور چابکدستی رکھتے ہوں، جن کے دل میں نام و نمود اور اقتدار کی خواہش کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو اور اس خواہش کی تکمیل کے لیے وہ تمام ایسے کام کرنے پر تیار رہوں جن سے کسی ملک کی فضا میں سنسنی پیدا کی جا سکے اور اخلاقی اعتبار سے اس قدر دیوالیہ ہوں کہ اگر انہیں اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لیے پوری قوم کے مفاد کو داؤں پر لگانا پڑے تو اس میں بھی انھیں قطعاً کوئی باک محسوس نہ ہو۔

دورِ جدید میں مختلف ممالک کے اندر اُبھرنے والی قیادتوں پر اگر نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جنہیں قوم کے اندر منفی جذبات کی پرورش کرنے میں کمال حاصل ہے۔ ایسے لوگوں نے کبھی بھی قوت اور ہمت کے ساتھ قوم کے غلط رجحانات کو صحیح رُخ پر موڑنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان رجحانات میں مزید بگاڑ پیدا کر کے قوم کو بڑی تیزی کے ساتھ بربادی کی راہ پر دھکیلنے کا سامان کیا ہے۔ یہ طالع آزما رہنما سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ قوم کے مختلف طبقوں کے اندر کیا کیا خامیاں پائی جاتی ہیں اور انہیں کن کن محرومیوں کا احساس ہے۔ ان دو چیزوں کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد پھر یہ لوگ ان خامیوں اور محرومیوں سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان رہنماؤں کا حال ان نشہ آور اشیاء فروخت کرنے والوں کا سا ہے جو ہر وقت نہ صرف گاہکوں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں بلکہ نئے نئے گاہک تیار کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اس غلط ذہنیت کے لوگ آخر عوام کی اصلاح کس طرح کر سکتے ہیں۔ ایک صحیح قائد کا فرض تو یہ ہے کہ قوم جن جن برائیوں میں گرفتار ہے وہ ان کی نشاندہی کرے، ان کے خلاف عوام کے اندر گہرا احساس پیدا کرے اور پھر انہیں اس بات

پر آمادہ کرے کہ انہیں ان بُرائیوں سے نجات حاصل کرنی ہے۔ مگر یہ کام بڑا صبر آزما کام ہے۔ قوم کو اچھے اور پاکیزہ مقصد کی خاطر اپنے پیچھے لگانے کے لیے قائد کو نہ صرف بڑے ایثار سے کام لینا پڑتا ہے بلکہ خود اپنے آپ کو اچھی سیرت کا نمونہ بھی بنانا پڑتا ہے۔ اس ایجابی کام سے دوسرا سلبی کام بہت زیادہ سہل اور آسان ہے، یعنی قوم جس غلط راہ پر گامزن ہے اسے نہ صرف اس پر چلنے دیا جائے بلکہ اس غلط سمت میں اس سے آگے بڑھ کر اُسے پیچھے لگا لیا جائے۔ جس طرح ایک شرابی شراب کے نشے میں بدمست ہو کر اپنا حقیقی خیر خواہ اس شخص کو خیال کرتا ہے جو اُس کے لیے اس ام الخبائث کے زیادہ سے زیادہ جام لنڈھا سکے اور وہ اُس شخص کو اپنا دشمن تصور کرتا ہے جو اسے اس بُرائی سے باز رہنے کی تلقین کرے، بالکل اُسی طرح جب کسی قوم کے اندر بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو وہ ان لوگوں کی قیادت اور سیادت قبول کرتی ہے جو اُنہیں بگاڑ سے نکالنے کے بجائے اس میں مزید بگاڑ پیدا کرنے کی بدرجہ اتم صلاحیت رکھتے ہوں۔ وہ عقل کی بات سمجھانے والوں کو اپنا دشمن اور بربادی کی راہ پر لے جانے والوں کو اپنا بہی خواہ خیال کرتی ہے۔ گذشتہ دو سو سال میں دنیا کے اندر جس قدر تباہی آئی ہے اور انسانیت کو جو بے پناہ مصائب جھیلنے پڑے ہیں وہ سب اس غلط قیادت کی ہیجان انگیزیوں کے بالکل فطری ثمرات ہیں۔

مسلمان قوم کے لیے اُس دن سے زیادہ کوئی منحوس دن نہ تھا جب اُس کے اندر جارحانہ قوم پرستی کے جراثیم پھیلنے شروع ہوئے۔ مغربی اقوام خصوصاً یہودی عرصہ دراز سے اس ٹوہ میں لگے ہوئے تھے کہ وہ کونسی ایسی تدبیر ہوسکتی ہے جو مسلمانوں کے شیرازہ کو منتشر کر سکے۔ اس ناپاک مقصد کے حصول کے لیے یوں تو مختلف ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے رہے اور اب بھی کیے جا رہے ہیں مگر ان میں سب سے زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز تجویز یہی تھی کہ کسی طرح مسلمانوں کے اندر مغربی قومیت کے تصورات کو رواج دیا جائے کیونکہ اُن کے سرایت کر جانے کے بعد اُنہیں کوئی چیز تباہ ہونے سے بچا نہ سکے گی۔ پھر یہ کام بھی نسبتاً آسان ہے اور اسے غیر محسوس طور پر بغیر خطرے کا

کوئی الارم پیدا کیے آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کے دشمنوں نے اس کا آغاز وطن کی محبت کے فطری جذبے سے کیا۔ پھر مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا کیا کہ وطن کے مفادات دوسرے سارے مفادات سے عزیز تر ہونے چاہییں اور کسی دوسرے ملک کے رہنے والے مسلمان اس بات کا حق نہیں رکھتے کہ ان کی خاطر انہیں قربان کیا جا سکے۔ اسلام کا رشتہ مقدس سہی مگر اسے وطن کے رشتے پر غالب نہ آنے دیا جائے۔ اسی طرح آہستہ آہستہ مسلمانوں کے اندر وطن پرستی کے جذبات پیدا کیے گئے۔ مسلم قوم کے اندر اسلام نے جس احساس کی آبیاری کی تھی وہ یہ تھی کہ اس کے ہر فرد کو اوّل و آخر مسلمان ہونا چاہیے اور اللہ کے دین کی خاطر ہی اسے زندہ رہنا اور مرنا چاہیے۔ اس ایک مقصد کے مقابلے میں باقی سب مقاصد غلط اور بیکار ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ خدا کی محبت کے ساتھ وطن کی محبت کا سلسلہ شروع ہوا اور دینی مفادات کے پہلو بہ پہلو وطنی مفادات بھی ابھرنے لگے۔ مگر یہ صورتِ حال زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی، کیونکہ دنیا کی ہر قوم کو قدم قدم پر یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اس کے نزدیک زندگی کا اہم ترین مقصد کونسا ہے اور اس کی روشنی میں اس کی سب سے قیمتی متاع کیا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے اسے جدوجہد کا کونسا انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو بھی وطن پرستی اور خدا پرستی، دینی تقاضوں اور وطنی مفادات کے درمیان جلد فیصلہ کرنا پڑا کیونکہ یہ فیصلہ کیے بغیر ان کا زندہ رہنا ممکن نہ تھا۔ انہوں نے شروع میں تو اس ذہنی کشمکش کو ملت اور قوم کے درمیان لفظی تفریق کر کے اسے چھپانے کی کوشش کی مگر خدا کی پرستش اور وطن کی پرستش کو چونکہ بیک وقت نبھانا ناممکنات میں سے ہے اس لیے انہوں نے جلد ہی یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ پہلے وطن کے پرستار ہیں اور بعد میں خداوند تعالیٰ کے اطاعت شعار۔ مغرب نے قومیت کا جو نیا مذہب پیش کیا ہے اس میں یوں تو سوائے مذہب وطنیت کے کسی دوسرے جاندار مذہب کے وجود کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی مگر خاص طور پر اسلام کو تو وہاں کسی صورت بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام ایک ہمہ گیر نظامِ حیات ہے جو زندگی کے سارے گوشوں پر حاوی ہے۔ وہ وطن کے بارے میں بھی ایک خاص زاویۂ نگاہ رکھتا ہے جو اس فلسفے سے براہِ راست متصادم ہے جسے مغربی قوم پرستی نے جنم دیا ہے اس لیے وہ قوم جو ایک ہی وقت میں اسلام اور مغربی قومیت کے نظریہ کو اپنانے کی کوشش کرتی ہے

وہ جلد از جلد انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔ اگر وہ ملکی اور قومی مفادات کو اولیّت کا درجہ دیتی ہے تو اسے بہت سے دینی تقاضے پس پُشت ڈالنے پڑتے ہیں اور اگر وہ دینی تقاضوں کو پُورا کرنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ بہت سے قومی مفادات نظر انداز کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جس طرح کوئی فرد بیک وقت دو مخالف سمت میں چلنے والی کشتیوں میں پاؤں نہیں رکھ سکتا بالکل اسی طرح ملّتِ اسلامیہ اسلام اور مغربی قومیّت کو ایک ہی وقت میں اپنا کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسے دونوں میں بہر حال ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ دو تین ممالک کو چھوڑ کر دنیا کے تمام مسلم ممالک نے وطن پرستی کا مسلک اختیار کیا۔ اور اس کے تقاضوں کے تحت اپنی قومی زندگی کی تشکیل شروع کی۔ اسلام وہاں سے بالکل نیست و نابود تو نہ ہو سکا مگر وہ کوئی انقلاب انگیز قوت کی حیثیت سے بھی باقی نہ رہا۔ وہاں کے عوام نے اسے چند بے جان رسوم کا مجموعہ سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ اس حیثیت میں آخر کوئی دین کتنے دنوں تک زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کا دین وطنیت کے ہر آن بڑھتے ہوئے تقاضوں کے پیشِ نظر زندگی کے ہر میدان میں اپنی بساط لپیٹتا چلا گیا اور بالآخر مسلم ممالک میں بالکل مغلوب و مفلوج ہو کر رہ گیا۔

جو دو تین مسلم ممالک وطن پرستی کے اس حملے سے محفوظ رہے ان میں سرِ فہرست پاکستان ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ ملک وطن پرستی کے خلاف مسلسل جہاد اور اس دینِ باطل پر دینِ حق کے تسلط اور غلبے کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آیا ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ یہ قدرت کا ایک بہت بڑا کرشمہ ہے کہ برصغیر ہند و پاک کی جو زمین مذہبِ وطنیت کی عملداری کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھی اسی میں اسے شکست اٹھانا پڑی اور یہاں مسلمانوں نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا کہ اسلام کا رشتہ خاک و خون کے رشتوں سے کہیں زیادہ مضبوط اور قوی ہے۔ جن ممالک میں مسلمانوں کی آبادی نوّے اور اسّی فیصد ہے وہاں تو انہوں نے مذہب کے بُت کی پرستش شروع کر دی ہے مگر جس ملک میں ان کی آبادی ۲۵ فیصد سے بھی کم تھی وہاں اُنھیں اللہ تعالیٰ نے علمِ حق بلند کرنے کی توفیق دی اور انہوں نے اللہ کے مطیع و فرمانبردار بندوں کی طرح پُوری دنیا کے سامنے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ اوّل و آخر مسلمان ہیں۔ وطن سے انہیں بھی محبت ہے مگر اس محبت کا

یہ مطلب نہیں کہ وہ فلسفہ وطنیت کی کوئی ایسی صورت گوارا کریں جو اسلامی تعلیمات سے متصادم ہو۔ وہ آزادیٔ وطن اور تعمیرِ وطن کے لیے اپنے سامنے جو نقشہ رکھتے ہیں اُس میں اسلام نے رنگ بھرا ہے۔ وہ وطنی تقاضوں سے صرفِ نظر کرنا نہیں چاہتے مگر انہیں اس انداز سے پورا کرنے کے آرزومند ہیں جو اسلام نے سکھلایا ہے۔ ان کی قوت کے چشمے خاکِ وطن کی محبت سے نہیں اُبلتے بلکہ خدا اور اس کے رسول کی محبت سے اُبلتے ہیں۔ اللہ کے دین نے جو حیثیت وطن کو دی ہے وہ اسے اسی حیثیت پر رکھنے کے متمنی ہیں۔ اسے خدا کے مقام پر فائز کرنے کے لیے کسی صورت بھی تیار نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ ان کے نزدیک کفر ہے۔

وطن پرستی کے اس دور میں یہ نظریہ پوری دنیا کے لیے بڑا حیران کن تھا مگر اس برِصغیر کے مسلمانوں کے لیے یہ اُن کے دل کی آواز تھی۔ انہیں بعض تاریخی اسباب کی وجہ سے اس دین کی اہمیت کا پوری طرح احساس تھا۔ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ اس دین کی بدولت ان کا الگ ملی وجود قائم ہے اور وہ ہندو قومیت کی یلغار سے محفوظ ہیں۔ اس سرزمین میں لاتعداد قومیں نمودار ہوئیں مگر ان کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا۔ انہیں نہ تو زمین نگل گئی ہے اور نہ آسمان اُچک کر لے گیا ہے بلکہ انہیں ہندو قومیت کا دیوِ استبداد نگل گیا مگر مسلم قوم نے اسلام کی قوت کی وجہ سے اس دیو کے دانت کھٹے کر دیئے اور اس سے یہ بات تسلیم کرا لی ہے کہ اسے ایک الگ قوم کی حیثیت سے ایک علیحدہ وطن میں باعزت طور پر جینے کا حق ہے۔

پاک و ہند کی سرزمین میں مسلمانوں پر اسلام کا دوسرا بڑا احسان یہ رہا ہے کہ اُن کے ہاں نہ تو آج سے پہلے ملحدانہ تحریکات کی پذیرائی ہوئی اور نہ الحاد کی علمبردار قیادت کو سر اٹھانے کا موقع ملا۔ جس تحریک یا جس شخصیت کا اسلام سے جس قدر تعلق کم تھا اسے مسلم قوم کے اجتماعی ضمیر نے اسی نسبت سے مسترد کر دیا۔ مسلم معاشرے نے بعض بڑے نامور مفکر، ادیب، سیاستدان اور منتظمین پیدا کیے مگر مسلمانوں نے ان میں کسی ایک کی بھی محض اس وصف کی بنا پر پذیرائی نہیں کی بلکہ انہیں اگر اپنے دل میں عزت و احترام کا کوئی مقام دیا تو اس کی وجہ ان کی اللہ کے دین سے وابستگی تھی۔ اس حقیقت کو جاننے کے لیے کسی لمبی چوڑی تحقیق

کی ضرورت نہیں۔ اس ملک کی تاریخ پر سرسری نگاہ ڈالنے سے اس کے بے شمار ثبوت فراہم کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً یہ دیکھیے کہ اس برصغیر میں مسلم قوم میں کتنے ایسے صاحبِ اختیار بادشاہ پیدا ہوئے ہیں جو اپنی قوت و طاقت کے اعتبار سے غیر معمولی طور پر نمایاں تھے مگر ان بادشاہوں کے مقابلے میں شہرت و ناموری ان بندگانِ خدا کے حصے میں آئی ہے جن کا سرمایہ بجز زہد و تقویٰ کے اور کوئی چیز نہ تھی۔ اکبر اور جہانگیر کے مقابلے میں مجدد الف ثانیؒ کی بے مثال مقبولیت اس دعویٰ کی واضح شہادت پیش کرتی ہے۔ پھر خود ان بادشاہوں کے درمیان مسلمانوں نے صرف دین کی بنیاد پر تفریق کی اور جسے جس قدر دین کے قریب پایا اسے اسی قدر عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا اور جسے دین سے جس قدر دُور پایا اسی تناسب سے اس کے خلاف نفرت کا اظہار کیا۔ ناصر الدین محمودؒ کے بارے میں مسلمان جو عقیدت کے نہایت گہرے جذبات رکھتے ہیں اس کی وجہ سوائے اس فقیر بادشاہ کی پرہیزگاری اور خدا ترسی کے اور کیا ہے اور جلال الدین اکبر اپنی ساری صلاحیتوں اور انتظامی کارناموں کے باوجود اگر مسلمانوں کی نظر میں قابلِ نفرت ہے تو اس کا سبب بھی اس کا دینِ حق سے انحراف ہے۔

مسلم حکومت کے خاتمے کے بعد بھی مسلمانوں کے اس طرزِ فکر میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ انہوں نے بلاشبہ اسلام کے نام پر بعض تحریکوں اور بعض شخصیتوں کے بارے میں دھوکہ کھایا مگر اسلام کو ان کے ہاں ہمیشہ اولیت کا مقام ہی حاصل رہا۔ مغرب کی الحاد پرستی نے اس قوم میں بڑے ضرر رساں اثرات مرتب کیے مگر اس قوم نے اپنی ساری اعتقادی اور عملی کوتاہیوں کے باوجود اسلام سے بغاوت کی راہ اختیار نہ کی بلکہ اس کے دل میں ہمیشہ یہ خواہش موجزن رہی کہ اُس کی اجتماعی زندگی کی تعمیر اسلام کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ اسی خواہش کی تکمیل میں یہاں کے مسلمانوں نے مختلف ادوار میں مختلف دائروں میں جدوجہد کی۔ خود پاکستان کا وجود اس خواہش کا مظہر ہے۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جس کے مختلف حصوں کے مابین سوائے اسلام کے رشتے کے اور کوئی دوسرا ایسا رشتہ موجود نہیں جو انہیں ایک دوسرے سے جوڑ سکے۔ یہ دو ایسے بازوؤں پر مشتمل ہے جن کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ حائل ہے اور بیچ میں ایک ایسی قوم کا غلبہ ہے جسے اسلام اور مسلمان کا نام بھی گوارا نہیں۔ پھر ان دونوں بازوؤں میں جو لوگ آباد ہیں ان میں بھی کوئی چیز (باقی پر)

"حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت"

"البلاغ" کے خصوصی نمبر پر تبصرہ

(۲)

اس بات کو پہلے اجمالاً بیان کیا جا چکا ہے کہ بدعت کا لفظ کوئی گالی نہیں ہے بلکہ اسے امر مسنون کے بالمقابل استعمال کیا جاتا ہے، جیسے کہ سنّی و بدعی طلاق۔ اب میں مدیر "البلاغ" کو ذرا کھول کر بتانا چاہتا ہوں کہ متعدد فقہاء و ائمہ نے امیر معاویہؓ کی بہت سی ایسی اوّلیات کو بھی بدعت قرار دیا ہے جن کے حق میں شرعی دلائل بھی موجود ہیں اور بعض فقہاء و محدثین بھی جن میں امیر معاویہ کے ہمنوا ہیں۔ مثال کے طور پر قضاء بالیمین والشاہد کے مسئلے کو لیجیے۔ اس میں امیر معاویہؓ کا فیصلہ یہ ہے کہ مدعی اگر اثباتِ دعویٰ کے لیے دو گواہ پیش نہ کر سکے تو ایک گواہ اور ایک قسم کے ساتھ دعویٰ پایۂ ثبوت کو پہنچ سکتا ہے۔ اس کی تائید بعض احادیث سے ہوتی ہے اور بعض فقہاء کا یہ مسلک بھی ہے۔ اب اس کے بعد "التوضیح" کا یہ قول دیکھیے جو علّامہ صدر الشریعۃ نے شرائط راوی کے ضمن میں درج کیا ہے اور جسے میں پہلے بھی نقل کر چکا ہوں۔

اوّلیاتِ معاویہؓ پر اطلاق بدعت ذکر فی المبسوط

ان القضاء بشاھد و یمین بدعۃ واوّل من قضی بہ معاویۃ۔

مبسوط میں مذکور ہے کہ ایک گواہ اور ایک قسم کی بنیاد پر فیصلہ کرنا بدعت ہے اور جنہوں نے سب سے پہلے ایسا فیصلہ کیا، وہ معاویہؓ ہیں۔

(التوضیح والتلویح، مطبوعہ نولکشور ص ۳۱۱ بسنہ ۱۲۹۲ھ)

اس کے بعد مؤطا امام محمد، باب الیمین مع الشاہد کا قول ملاحظہ ہو:

ذکر ابن ابی ذئب عن ابن الشہاب — ابن ابی ذئب روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے امام

الزھری قال سألته عن الیمین مع الشاھد فقال بدعة واول من قضیٰ به معاویة۔	زہری سے ایک قسم اور ایک گواہ کے بل پر فیصلہ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ بدعت ہے اور پہلے جنہوں نے ایسا فیصلہ کیا وہ حضرت معاویہؓ ہیں۔

اس مقام کی شرح میں مولانا عبدالحی مرحوم "التعلیق الممجد" میں لکھتے ہیں:

قال ابن ابی شیبة حدثنا حماد بن خالد عن ابن ابی ذئب عن الزھری قال ھی بدعة واول من قضیٰ بھا معاویة	ابن ابی شیبہ حماد بن خالد سے اور وہ ابن ابی ذئب سے اور وہ امام زہریؒ سے راوی ہیں کہ انہوں نے کہا کہ یہ (فیصلہ) بدعت ہے اور پہلا ایسا فیصلہ امیر معاویہؓ نے کیا۔
وفی مصنّف عبد الرزاق اخبرنا معمر عن الزھری قال ھٰذا شیئ احدثه الناس لابد من شاھدین (الموطا الامام محمد مع التعلیق الممجد صفحہ ۳۶۱ مطبع مصطفائی، ۱۲۹۷ھ)	اور مصنّف عبدالرزاق میں ہے، ان سے معمر نے اور انہوں نے زہری سے روایت کی ہے کہ امام زہری نے کہا کہ یہ فیصلہ لوگوں نے نیا اور نرالا نکال لیا ہے۔ اثباتِ دعویٰ کے لیے دو گواہوں کا ہونا لازم ہے۔

شرح الوقایہ، کتاب الدعویٰ میں اسی قضا بیمین و شاہد کے متعلق درجِ ذیل قول ملاحظہ فرمایئے:

عندنا ھٰذا بدعة واول من قضیٰ به معاویة۔	ہمارے نزدیک اس طرح کا فیصلہ بدعت ہے اور امیر معاویہؓ نے سب سے پہلے ایسا کیا۔

(شرح الوقایہ مع حاشیہ چلپی، مطبوعہ نولکشور ۱۳۲۶ھ صفحہ ۲۵۹)

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے المسوّی و المصفیٰ شرح الموطا کا ایک اقتباس میں پہلے دے چکا ہوں۔ مؤطا امام مالک، کتاب الزکوٰۃ میں امام زہری ہی کی ایک روایت یوں ہے:

عن ابن شھاب انه قال اول من اخذ من الاعطیة الزکوٰة معاویة ابن ابی سفیان۔	ابن شہاب سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ سب سے پہلے جنہوں نے سرکاری عطیات میں سے زکوٰۃ وصول کی، وہ معاویہؓ ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ امیر معاویہؓ لوگوں کو عطیے دیتے وقت ہی ان عطیات پر پیشگی زکوٰۃ لے لیتے تھے

حالانکہ پہلے ایسا دستور نہ تھا۔ اب دیکھیے یہاں امام زہریؒ نے تو بدعت کا لفظ استعمال نہیں کیا، لیکن شاہ ولی اللہ صاحب اس کی شرح فرماتے ہیں:

یعنی گرفتن زکوٰۃ از سالیانہ و ماہیانہ در وقتیکہ کسی را دادہ شود بدعت است۔	یعنی سالانہ و ماہانہ عطایا پر کسی کو دیتے وقت ہی زکوٰۃ وصول کرنا بدعت ہے۔ (المصفیٰ ص۲۰۷)

کیا اس کا صاف مطلب نہیں ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے امام زہری کے الفاظ اوّل من اخذ کا مدعا یہی قرار دیا ہے کہ یہ بدعت ہے؟ تو پھر مولانا مودودی نے اگر امام زہری کے بعینہٖ اسی طرح کے الفاظ (اوّل من قصرھا) سے یہ مراد لے لیا ہے کہ امیر معاویہؓ نے سنت کو بدل دیا اور عمرؒ بن عبدالعزیز نے بدعت کو ختم کیا، تو آخر کونسا ناقابلِ عفو جرم کر لیا؟ سلف سے خلف تک سارے اصحاب جنہوں نے امیر معاویہؓ کی بدعات کا ذکر کیا ہے جناب مولانا محمد تقی عثمانی مدیر البلاغ کو چاہیے کہ کوئی فتویٰ اُن حضرات کی پاکیزہ ارواح تک بھی رسید فرمائیں اور ساری قوت مولانا مودودی اور میرے خلاف ہی نہ صرف کرتے رہیں۔ اگر اس فہرست میں اضافہ مطلوب ہو، تو بندہ اس کے لیے بھی حاضر ہے۔ مولانا عثمانی صاحب کو یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ سارے اقتباساتِ مذکورہ بالا میں امیر معاویہؓ کے جن فیصلوں پر بدعت کا اطلاق کیا گیا ہے، ان کے حق میں دلائلِ شرعیہ موجود ہیں۔ ایک قسم اور ایک گواہ کی موجودگی میں بعض حالات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا مدعی کے حق میں فیصلہ حدیث میں مذکور ہے جسے مؤطا امام محمد وغیرہ میں نقل بھی کیا ہے اور امام شافعیؒ امام احمد اور امام مالک کا یہی مسلک ہے۔ اسی طرح پیشگی زکوٰۃ لینے کی گنجائش قواعدِ شرعیہ میں نکل سکتی ہے مگر احادیث مشورہ و مستفاضہ اور تعاملِ خلافتِ راشدہ سے متعارض ہونے کی بنا پر ان سب اصحاب نے امیر معاویہؓ کے قضایا کو بدعت قرار دیا ہے۔ نیز ان حضراتِ احناف کا استدلال یہ ہے کہ قرآن مجید میں دو گواہوں کا نصاب شہادت مقرر کیا گیا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا بھی ارشاد ہے کہ شہادت مدعی کے ذمّے ہے اور قسم انکارِ دعویٰ کرنے والے مدعا علیہ کے لیے ہے۔

"ترجمان" کے گزشتہ شمارے میں یہ امر ایک مرتبہ پھر واضح کر دیا گیا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے مسلمان کو کافر کا وارث بنانے کا جو فیصلہ کیا تھا، وہ کتاب وسُنّت اور اجماعِ خلافتِ راشدہ کے خلاف تھا۔ اس پر صحیح منقول

میں نہ اجتہاد کا اطلاق ہو سکتا ہے، نہ اسے سُنّت یا سُنّتِ ثانیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ پُوری سلطنت کے اندر اس کا نفاذ و رواج بدعت کی تعریف میں آتا ہے اور صرف مولانا مودُودی نے نہیں بلکہ دوسرے اصحاب سلف نے بھی اسے بدعت اور باطل قرار دیا ہے۔

مسئلۂ دیت | اب مَیں مولانا مودودی کی دوسری عبارت نقل کرتا ہوں جس پر "البلاغ" میں تنقید کی گئی ہے۔ وہ عبارت یہ ہے:

"حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ دیت کے معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے سُنّت کو بدل دیا۔ سُنّت یہ تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہو گی، مگر حضرت معاویہؓ نے اس کو نصف کر دیا اور باقی نصف خود لینی شروع کر دی۔"

مدیر البلاغ فرماتے ہیں کہ مَیں نے اس عبارت پر چار اعتراض کیے تھے۔ ان کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ مولانا مودُودی نے یہ جملہ اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے کہ دیت کے معاملے میں حضرت معاویہؓ نے سنت کو بدل دیا۔ اس اعتراض کا جواب وہی ہے جو پہلے توریث والے حوالے کے متعلق دیا جا چکا ہے۔ اس مقام پر بھی مولانا مودُودی نے ابن کثیرؒ کے قول کی بالمعنی روایت اپنے الفاظ میں کی ہے اور اپنی عبارت کا ایک جز بنا کر کی ہے اگر مولانا ابن کثیر کے قول کا بعینہٖ لفظی ترجمہ کرتے تو ترجمے کو الگ سطور میں یا واوین میں دیتے۔ مگر انہوں نے مفہوم کی اپنے الفاظ میں ترجمانی کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ ان الفاظ سے بھی زیادہ محتاط ہیں جو مسئلۂ توریث میں مولانا محترم نے استعمال کیے ہیں۔ وہاں بدعت[1] کا لفظ لکھا تھا اور یہاں صرف یہ لکھا ہے کہ "سنت کو بدل دیا"۔ اب اس جملے پر یہ اعتراض تو بالکل بے محل ہے کہ اسے مولانا نے اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے کیونکہ یہ ان کی اپنی عبارت ہی کا ایک حصہ ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ حافظ ابن کثیر کے قول کی توضیح کے طور پر بھی یہ فقرہ صحیح نہیں کہ امیر معاویہؓ نے سنت کو بدل دیا، تو اس اعتراض میں بھی کوئی وزن نہیں ہے۔ آخر ابن کثیر

[1] یہاں یہ بات بھی قابل وضاحت ہے کہ توریث والے مسئلے میں بھی مولانا مودُودی کے الفاظ یہ نہیں کہ امیر معاویہؓ نے بدعت کا ارتکاب کیا، بلکہ اصل الفاظ یہ ہیں کہ "حضرت معاویہؓ نے اپنے زمانۂ حکومت میں مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا" اور "حضرت عمر بن عبدالعزیز نے آکر اس بدعت کو موقوف کیا مگر ہشام نے اپنے خاندان کی روایت کو پھر بحال کر دیا۔"

جب فرما رہے ہیں کہ پہلے سُنّت یہ چلی آ رہی تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کے مساوی ہو، اور حضرت معاویہؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے دیت کو نصفا نصف کر کے آدھی اپنے لیے مختص کر لی، تو اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے سنت کو بدل دیا؟

یہاں ایک اور بات جس کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ خلافت و ملوکیت میں مولانا نے جتنے مراجع و مآخذ کا حوالہ دیا ہے، ان کی اصل عربی عبارتیں شاذ و نادر ہی کہیں درج کی ہیں۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ حوالے اتنے کثیر و متعدّد تھے کہ سب کا اندراج کتاب کو کم از کم پانچ چھ گنا ضخیم بنا دیتا اور پھر لاطائل تکرار اور تحصیلِ حاصل بالکل عبث ہوتی لیکن عجیب حُسنِ اتفاق ہے کہ دیت والی بحث کے اس خاص مقام پر مولانا مودودی نے اپنی کتاب ص ۱۷۴ کے حاشیے پر ابنِ کثیر کا وہ اصل جملہ بھی نقل کر دیا ہے جس میں ترمیم و تحریف کا الزام مولانا کے خلاف عائد کیا گیا ہے۔ مولانا حاشیہ ۲۶ میں لکھتے ہیں:

"ابن کثیر کے الفاظ یہ ہیں: وکان معاویۃ اول من قصرھا الی النصف واخذ النصف لنفسہ۔"

اب اگر مولانا کا ارادہ واقعی یہی ہوتا کہ وہ ابن کثیر کی طرف کوئی غلط بات منسوب کریں یا ان کے مفہوم میں کوئی ناروا اور غیر جائز اضافہ کریں تو انہیں اصل عربی عبارت نقل کر دینے میں ضرور تامّل ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اصل الفاظ دے دینے کے بعد تو یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ یہاں لفظی ترجمہ مقصود نہ تھا کہ اس میں تبدیلی یا اپنی طرف سے کچھ بڑھا دینے کا سوال پیدا ہو سکے۔ اس کے بعد بھی اس الزام کو برابر لگائے چلے جانا کہ "اصل کتاب میں یہ جملہ بالکل موجود نہیں ہے، نہ ابن کثیرؒ نے یہ جملہ کہا، نہ امام زہریؒ نے" اسے خواہ مخواہ کی خوردہ گیری کے ماسوا اور کس پر محمول کیا جا سکتا ہے؟ اس طرح اگر ہندی کی چندی نکالنی شروع کی جائے تو کونسا مصنّف ہے جو اعتراضات سے بچ سکے؟ اگر مدیر البلاغ میری بات کو پھر طعنِ اکابر نہ سمجھ بیٹھیں تو میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ قرآن مجید کے ایک ترجمے سے بعض اصحاب نے عبارتیں اور فقرے چُن چُن کر جمع کر لیے تھے اور انہیں "تحریفِ قرآن" کے عنوان سے چھاپ دیا تھا حالانکہ ایک مسلمان جتنی احتیاط کتاب اللہ کے ترجمے اور ترجمانی میں کرتا ہے کسی دوسری تصنیف کے معاملے میں نہیں کرتا۔

"دلچسپ غلطی" جناب عثمانی صاحب کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ومضت السنۃ ان دیۃ المعاھد کدیۃ المسلم...... یہ ابن کثیرؒ کا نہیں بلکہ امام زہریؒ کا قول ہے اور میرا یہ سمجھنا اور کہنا غلط ہے کہ یہ ابن کثیر کا قول ہے۔ یہ اعتراض بڑی اہمیت کے ساتھ البلاغ میں دُہرایا گیا ہے اور اس پر "ایک دلچسپ غلطی" کا عنوان قائم کر کے دو صفحے سے زائد میری تضحیک کی نذر کیے گئے ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ:

"مدیر البلاغ کو ملک صاحب سے استفادہ کرنے کی سعادت حاصل نہیں ہو سکی لیکن عربی مدارس کا ادنیٰ طالب علم بھی اس بات کو جانتا ہے کہ یہ محدثین کا جانا بوجھا طریقہ ہے کہ جب وہ ایک سند سے کسی کا ایک مقولہ ذکر کرتے ہیں اور پھر آگے اسی سند سے اسی شخص کا دوسرا مقولہ نقل کرنا چاہتے ہیں تو دوسرے مقولے میں سند کا اعادہ کرنے کے بجائے شروع میں وبہٖ قال کہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ بہٖ کی ضمیر سند کی طرف راجع ہوتی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مذکورہ سند ہی سے اس کا یہ قول ہم تک پہنچا ہے۔...... بہرکیف جس شخص کو حدیث اور تاریخ کی عربی کتابوں سے ادنیٰ ممارست بھی رہی ہو وہ اس حقیقت میں شبہ نہیں کر سکتا کہ دیت کے بارے میں یہ مقولہ امام زہری کا ہے۔ ہمیں اندازہ نہ تھا کہ ملک صاحب کے لیے اتنا اشارہ غلط فہمی کا سبب بن جائے گا اور وہ جواب میں ہمیں بہٖ قال کے مفہوم سے باخبر کرنے کی سعادت عطا فرمائیں گے۔ ہم سمجھتے تھے کہ اہلِ علم کے لیے اتنا اشارہ کافی ہو گا"۔

مَیں اِس بات کا کھلے دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ میری عمر کا بہترین حصہ اسکول اور کالج میں ضائع گیا۔ اللہ تعالیٰ مولانا مودودی کو جزائے خیر عطا فرمائے، جب ان کی ایمان افروز تحریروں اور تقریروں نے میرے نظریات کو بدلا، تب مجھے عربی اور دینی علوم سے تہی دستی کا شدید احساس ہوا۔ مَیں نے جس حد تک بھی بن پڑا اپنی محرومی و تشنگی کو رفع کرنے کی کوشش کی مگر افسوس کہ مَیں ان علوم و آداب کی باقاعدہ تحصیل و تکمیل نہ کر سکا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ حدیث، فقہ اور تاریخ کی ورق گردانی کے باوجود میں بہٖ قال کے اس مفہوم سے اب تک نابلد رہا کہ یہ جملہ بِھٰذا الاسناد قال کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اس پر کوئی صاحب جتنا مذاق چاہیں اڑالیں۔ میری نظر سے بہٖ قال کا جو استعمال اب تک گزرا ہے یا جو میری یادداشت میں محفوظ

رہ سکا ہے وہ یہی ہے کہ بالعموم جہاں پہلے ایک مسلک مذکور ہوتا ہے یا مذہبِ فقہی یا استنباط و اجتہاد کو بیان کیا جاتا ہے، وہاں متصلاً بعد بہ قال کہہ کر جن بزرگوں کا نام لیا جاتا ہے اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ مؤخرالذکر بھی مقدم الذکر مسلک کے قائل و حامل ہیں۔ مثلاً سنن ترمذی، باب الاستنجاء بالحجارہ میں پہلے حدیث اور پھر اکثر صحابہ کرام کا یہ مسلک منقول ہے کہ پتھر سے استنجاء کافی ہے پھر امام ترمذی فرماتے ہیں وبہ یقول الثوری وابن المبارك والشافعی واحمد واسحاق۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ سب حضرات بھی اسی مسلک کے قائل ہیں۔ اسی طرح مسح علی الخفّین میں حدیث اور مسلکِ صحابہ کے بیان کے بعد فرماتے ہیں وبه يقول مالك والشافعی واسحاق۔ آگے مسح علی الجوربین کے باب میں بھی اسی طرح کے الفاظ موجود ہیں۔ جس جگہ رائے اور قول فقہی میں مماثلت کے بجائے سند میں مماثلت ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے، وہاں محدثین کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ بہ یقول یا بہ قال کے بجائے بھٰذا الاسناد نحوہ بھٰذا السند، مثلہ من ھذا الوجہ یا صرف بہ لاتے ہیں۔ مثلاً اسی ترمذی میں آگے باب ان الماء من الماء آتا ہے۔ اس میں پہلے سند ہے: حدثنا احمد بن منیع ثنا عبد اللہ بن المبارك اخبرنا یونس بن یزید عن الزھری عن سھل بن سعد عن ابی بن کعب قال ... اس کے بعد دوسری حدیث میں چونکہ امام زہری سے حضرت ابیؓ تک سلسلہ اسناد وہی ہے جو پہلی حدیث میں ہے، اس لیے فرماتے ہیں عن الزھری بھٰذا الاسناد مثلہ۔ بہ قال اور بھٰذا الاسناد قال کے یہ دونوں بالکل الگ استعمالات سنن ترمذی میں بے شمار ہیں۔ مثال کے طور پر باب یقرأ القرآن علی کل حال میں حدیث کے بعد فرمایا ہے وبہ قال غیر واحد من اھل العلم اور آگے باب ما جاء فی تاخیر العصر میں پہلے ابن جریج کی ایک روایت ہے، پھر دوسری ہے جس میں عن ابن جریج بھٰذا الاسناد نحوہ کے الفاظ آئے ہیں۔

امام محمدؒ کی کتاب الآثار میں بکثرت روایات ایسی ہیں جن میں امام ابوحنیفہؒ سے کوئی حدیث یا اثر مروی ہوتا ہے اور اس کے بعد امام محمد یہ بھی لکھ دیتے ہیں وھو قول ابی حنیفہ جس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ تک جو روایت پہنچی ہے وہ یہ ہے اور جو مسلک یا مسئلہ اس روایت سے ثابت یا مستنبط ہے، امام صاحب کا فقہی مسلک بھی وہی ہے۔ امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں یہی انداز اختیار کیا ہے۔

مثلاً نکاح بغیر ولی کے باب میں ابن جریج سے حضرت عائشہؓ تک ایک سلسلۂ اسناد ہے۔ پھر دوسری روایت میں چونکہ ابن جریج سے اوپر تک سند وہی ہے، اس لیے اس کی تکرار کے بجائے فرماتے ہیں باسنادہ مثلہ۔ اس کے برعکس جہاں بھی سند کے بجائے مسلک کا ذکر مقصود ہوتا ہے تو لکھتے ہیں: ذھب الی ھذا الحدیث قوم فقالوا بہ (ملاحظہ ہو زکوٰۃ السائمہ) یا یوں لکھتے ہیں وھذا قول ابی حنیفۃ وابی یوسف ومحمد۔ امام مسلم اپنی الصحیح کے باب الاسلام وخصالہ میں پہلے ابوحیّان کی ایک سند بیان کرتے ہیں، پھر انہی کی دوسری سند کا ذکر یوں فرماتے ہیں: حدثنا ابوحیّان التیمی بھذا الاسناد مثلہ۔ آگے باب قول لا الٰہ الا اللہ میں جہاں ابوطالب کی وفات کا ذکر ہے، وہاں پہلے ابن شہاب زہری کی ایک روایت ایک سند کے ساتھ ہے، پھر انہی کی دوسری حدیث درج کرنے سے پہلے لکھتے ہیں عن الزھری بھذا الاسناد مثلہ۔ اس طرح کی مثالیں امام مسلم کے ہاں بکثرت موجود ہیں۔ لیکن بہ قال سے مراد بھذا السند قال ہو، اس کی کوئی مثال میری نگاہ سے نہیں گزری، البتہ جب سند یا اس کے حصے اور متن دونوں میں مماثلت ہو، تو دواہ ...
... بہ کا اسلوب آتا ہے، پھر بہ پر بالعموم جملہ ختم ہو جاتا ہے۔ بہ قال سے نئی روایت نہیں آتی۔

میرے وجوہِ ترجیح | اس کے باوجود بہ قال کہہ کر اگر سابق سند کو مراد لینا محدثین کا جانا بوجھا طریقہ ہو اور میرے سوا ہر ادنیٰ و اعلیٰ طالب علم اس سے شناسا ہو تو ایسی صورت میں حدیث کی کتابوں میں اس کے بے شمار نظائر موجود ہونے چاہییں۔ مَیں مدیر البلاغ کا شکر گزار رہوں گا اگر وہ چند مثالیں البلاغ میں نقل کر دیں۔ یا پھر مدیر موصوف یا قارئین میں سے کوئی دوسرے صاحب ذاتی طور پر مجھے مطلع فرما دیں۔ میری غلط فہمی و لاعلمی رفع ہو جائے گی۔ لیکن مَیں پھر بھی عرض کروں گا کہ اس طرح بلاشبہ ایک علمی نکتہ تو مجھ پر منکشف ہو جائے گا لیکن یہ بات پھر بھی بحث طلب رہے گی کہ بہ قال سے جو کچھ مَیں سمجھ رہا ہوں وہ درست ہے یا وہ مفہوم صحیح ہے جو مولانا عثمانی صاحب باصرار لے رہے ہیں۔ بشرطِ صحت پھر بھی گنجائش دونوں کی ہو گی اور میری غلطی دلچسپ ہو سکتی ہے تو ان کی کیوں نہیں ہو سکتی؟ واحد وجہ ترجیح جو مولانا عثمانی صاحب نے اپنے حق میں دی ہے وہ یہ ہے کہ اگر بہ قال کا تعلق توریث مسلم سے ہو، تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ امام زہریؒ نے حضرت معاویہؓ کے فیصلے کو صحیح سمجھا اور جس چیز کو وہ بدعت سمجھتے ہیں اسی کو اپنا مذہب بھی بنا لیا ہے۔

مولانا عثمانی صاحب کا یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ "یلہ قال الزھری" کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کے فیصلے کو صحیح قرار دے کر اُسی کو اپنا مذہب فقہی بنا رہے ہیں۔ امام زہری توریث کے باب میں جو اصل بات بیان کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ سُنت جو پہلے سے چلی آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ نہ کافر مسلم کا وارث ہو اور نہ مسلم کافر کا اور یہی امام زہری کا فقہی مسلک بھی ہے۔ اس طرح کی تصریح کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ محدّثین کی دیانت و امانت کا یہ ثمرہ ہے کہ وہ اپنے مسلک کے خلاف روایات بھی بلا تامل نقل کر دیتے ہیں۔ امیر معاویہؓ اور دوسرے بنو امیہ نے تو اس کے خلاف کیا، سوائے عمرؒ بن عبدالعزیز کے جنہوں نے اس سُنّت کو بحال کیا۔ بھلا امام زہری اس فیصلے کو کیسے صحیح قرار دیں گے جو سُنتِ ماضیہ کے موافق نہ ہو جبکہ وہ آغاز ہی میں یہ بتا رہے ہیں کہ ان کے نزدیک سنت یہ تھی کہ کافر و مسلم کے مابین توارث نہ ہو؟ یہ فی الواقع عجیب صورت ہے کہ مدیر "البلاغ" میرے اخذ کردہ مطلب کو طرفہ تماشا فرما رہے ہیں اور جو طرفگی ان کے اپنے استنباط میں ہے اُسے ملاحظہ نہیں فرماتے! امام زہری کی ایک روایت مؤطا امام محمد، باب لا یرث المسلم الکافر میں ایسی بھی موجود ہے جس میں امام مالک ان سے نقل کرتے ہیں کہ عقیل اور طالب چونکہ ابوطالب کی وفات کے وقت کافر تھے، اس لیے وہ ابوطالب کے وارث ہوتے اور حضرت علیؓ وراثت سے محروم رہے، کیونکہ وہ اسلام لا چکے تھے۔

مدیر البلاغ نے اپنے حق میں جو استدلال کیا ہے، اس کے جواب میں میرے اختیار کردہ مفہوم کے لیے مزید وجوہ ترجیح بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً البدایہ کے جتنے مختلف ایڈیشن میری نظر سے گزرے ہیں ان میں "وبلہ قال الزھری" کے بعد الٹی واؤ (؍) کا نشان موجود ہے اور یہ علامت بالعموم وصل کے بجائے فصل اور وقف کا فائدہ دیتی ہے اور سند اور متن کو اس علامت سے باہم جدا نہیں کیا جاتا۔ پھر سند کا آغاز واؤ سے ہو، اس کی کوئی مثال بھی یاد نہیں پڑتی۔ تاہم ان سب باتوں کو چھوڑتے ہوئے اور اپنا امکانِ خطا مانتے ہوئے میں مولانا محمد تقی صاحب کے اس فیصلے کو تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کیے لیتا ہوں کہ جس شخص کو حدیث و تاریخ کی کتابوں سے ادنیٰ ممارست بھی رہی ہو، وہ اس حقیقت میں شبہ نہیں کر سکتا کہ دیت کے بارے میں زیرِ بحث مقولہ حافظ ابنِ کثیر کا نہیں بلکہ امام زہری کا ہے، حافظ ابن کثیر نے صرف اسے نقل کیا ہے۔" میں نے تو پہلے ہی ترجمان، جون ۱۹۶۹ء میں عرض کر دیا تھا کہ "نفس مسئلہ پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ قائل خواہ ابن کثیر ہوں یا امام

زہری، قول یہی بیان ہوا ہے کہ سُنّت یہ چلی آرہی تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ہو۔" مدیر البلاغ پھر میرے جواب میں فرماتے ہیں کہ امام زہریؒ کا قول ہونے کی صورت میں اس قول کی تشریح سُنن بیہقی میں مروی امام زہری کے دوسرے قول کی مدد سے آسان ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اس طرح کوئی آسانی پیدا نہیں ہوتی کیونکہ دوسرا قول بھی یہی ہے کہ" یہودی و نصرانی کی دیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مسلمان کی دیت کے برابر تھی، اور حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمان رضی اللہ عنہم کے عہد میں بھی ایسا ہی رہا۔" باقی رہی سنن بیہقی کی یہ تشریح کہ امیر معاویہؓ آدھی دیت ورثاء کو دیتے تھے اور باقی نصف بیت المال میں داخل کرتے تھے (اس لیے آدھی دیت کو اپنے ذاتی استعمال میں لانے کا سوال نہیں)، تو اس سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مَیں نے سابق بحث میں واضح دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا تھا کہ دیت کے کسی حصے کو بیت المال میں لینے کا جواز بھی نہ قرآن سے نکلتا ہے، نہ سنت میں اس کا ثبوت ملتا ہے، نہ اُمت کے کسی فقیہ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔

لِنفسہ اور لبیت المال کی بحث مدیر "البلاغ" نے میرے استدلال کے اس اصل پہلو کا تو کوئی جواب نہیں دیا اور دونوں روایتوں میں لنفسہ اور لبیت المال کے لفظی اختلاف پر جو کچھ مَیں نے لکھا ہے، صرف اس کی تردید میں سارا زور صرف کر دیا۔ لکھتے ہیں کہ افسوس ہے کہ" ملک غلام علی صاحب کو اب بھی اس بات پر اصرار ہے کہ حضرت معاویہؓ آدھی دیت ذاتی استعمال ہی کے واسطے لیتے تھے اور بیہقی کی روایت میں جو بیت المال کا لفظ آیا ہے اس سے مراد بھی حضرت معاویہؓ کی ذات ہی ہے۔" افسوس جس طرح مدیر البلاغ کو ہے، اسی طرح مجھے بھی ہے کیونکہ وہ میری بات کو غلط مفہوم پہنا رہے ہیں۔ مَیں نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ حضرت معاویہؓ دیت اپنی ذات پر استعمال کرتے تھے۔ مَیں نے جو کچھ کہا ہے اور جسے خود انہوں نے نقل بھی کیا ہے، وہ یہ ہے کہ امیر معاویہؓ اور دوسرے بنو اُمیہ کے عائد کردہ غنائم و محاصل کے لیے ایک ہی واقعہ میں مؤرخین نے کہیں لِنَفسہ اور کہیں لبیت المال کا لفظ استعمال کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بیت المال ذاتی اور سیاسی مقاصد و اغراض کے لیے استعمال ہونے لگا تھا اور اُمراء بیت المال کے آمد و خرچ کے معاملے میں مسلمانوں کے سامنے جوابدہ نہ رہے تھے۔" یہ ایک بدیہی حقیقت ہے جسے تمام مؤرخین نے بیان اور تسلیم کیا ہے۔ مَیں نے اس بات کو زیادہ کھول کر بیان کرنا مناسب اور ضروری نہیں سمجھا تھا لیکن بڑا افسوس ہے کہ مدیر البلاغ نے یہ پھر مجھ سے مطالبہ کیا ہے کہ

کوئی دلیل ایسی پیش کی جاتی جس سے یہ دعویٰ ثابت ہو۔ میں نے جب پہلا سلسلۂ مضامین لکھا تھا اور اس میں ایک جگہ مولانا مودودی کا یہ فقرہ نقل کیا تھا کہ امیر معاویہؓ نے یزید کی ولی عہدی کے لیے خوف و طمع کے ذرائع سے بیعت لی تھی، اس وقت بھی بعض حضرات نے مجھ سے کہا تھا کہ تخویف کے ثبوت میں تو تم نے بخاری کی حدیث نقل کر دی تھی (جس میں امیر معاویہؓ کا یہ قول مروی ہے کہ کون ہمارے مقابلے میں اپنا سینگ اونچا کر سکتا ہے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس کا ترکی بہ ترکی جواب دینے سے محض اس وجہ سے رک گئے کہ انہیں خوں ریزی کا ڈر تھا) لیکن تم نے طمع دلانے کی کوئی مثال پیش نہیں کی۔

اب مدیر "البلاغ" اور دوسرے مطالبہ کرنے والے اصحاب کو میں خلافت و ملوکیت کے ص ۱۴۹، ۱۵۰ کا حوالہ دیتا ہوں، جہاں ایسی متعدد مثالیں درج ہیں، بالخصوص الکامل اور البدایہ کے حوالے سے یہ درج ہے کہ امیر معاویہؓ نے حضرت ابن عمرؓ ہی کو بیعتِ یزید پر آمادہ کرنے کے لیے ایک لاکھ درہم بھیجے تھے مگر انہوں نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ پھر تو میرا دین بڑا سستا ہو گیا۔ یہ واقعہ بکثرت مورخین و محدثین نے نقل کیا ہے مثلاً طبقات ابن سعد ج ۴، ص ۱۸۲، ترجمہ عبداللہ ابن عمرؓ مطبوعہ دار بیروت، دار صادر ۱۳۷۷ھ پر یہی قول موجود ہے۔ پھر میں امام محی الدین النووی کی ایک عبارت پیش کرتا ہوں جو کہ صحابۂ کرام کے محلِ نظر افعال و اختلافات پر کلام کرنے میں حد درجہ محتاط ہیں۔ انہوں نے تہذیب الاسماء واللغات میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکر الصدیق کے مختصر حالات درج کر کے آخر میں لکھا ہے:

ولمّا ابی البیعۃ لیزید بن معاویۃ بعثوا الیہ بمائۃ الف درھم لیستعطفوہ فردّھا وقال لا ابیع دینی بدنیای رضی اللہ عنہ۔	جب انہوں نے یزید کی بیعت سے انکار کیا تو ان کی طرف ایک لاکھ درہم بھیجے گئے تاکہ انہیں بیعت پر مائل کیا جائے، انہوں نے انہیں رد کر دیا اور فرمایا کہ دنیا کے عوض میں دین نہیں بیچ سکتا۔ اللہ ان سے راضی ہو۔

یہاں کسی صاحب کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ یہاں بیعت سے مراد امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید کے لیے خلافت کی بیعت ہے۔ امام نوَوِی نے اس ترجمے میں خود لکھا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن کی وفات مختلف اقوال کے مطابق ۵۳ھ یا ۵۵ھ یا ۵۶ھ میں ہوئی اور معلوم ہے کہ امیر معاویہؓ کا انتقال وسط ۶۰ھ

میں ہوا۔ اس لیے یہاں بیعت سے مراد یزید کی ولی عہدی کی بیعت ہے جس کے لیے ۵۰ھ ہی سے کوشش شروع ہو گئی تھی لیکن جیسا کہ امام نووی کا انداز ہے، انہوں نے امیر معاویہؓ یا ولی عہدی کا نام لیے بغیر پوری بات بیان کر دی، اور اس کتاب میں کر دی جو ایک چھوٹی سی انسائیکلو پیڈیا ہے جس میں چھانٹ کر مواد جمع کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ زیادہ تصریح کے ساتھ دوسرے مورخین نے بھی نقل کیا ہے۔ مثال کے طور پر حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

بعث معاویۃ الی عبد الرحمٰن بن ابی بکر بمائۃ الف درھم بعد ان ابی بیعۃ لیزید ابن معاویۃ فردھا عبد الرحمٰن وابی ان یأخذھا وقال: ابیع دینی بدنیای؟ (البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۸۹)

معاویہؓ نے عبد الرحمٰن بن ابی بکر کی طرف ایک لاکھ درہم اس وقت بھیجے جب انہوں نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا۔ حضرت عبد الرحمٰنؓ نے انہیں رد کر دیا اور انہیں لینے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا "کیا میں اپنے دین کو دنیا کے عوض میں فروخت کر دوں؟"

اب کیا مدیر "البلاغ" مجھے بتا سکتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہؓ کے پاس اتنا فراواں مال کہاں سے آ گیا تھا اور کیا ان اغراض کے لیے اسے خرچ کرنا صحیح تھا خواہ یہ رقوم ذاتی ہوں یا بیت المال کی ہوں؟ صحیحین میں روایت موجود ہے کہ جب فاطمہ بنت قیس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ لیا کہ میں معاویہؓ سے نکاح کر لوں؟ تو آنحضورؐ نے فرمایا انہ صعلوك (وہ تو بالکل نادار ہیں)۔

اگر مدیر "البلاغ" ان نظائر اور میری بحثِ سابق میں بیان کردہ دلائل و شواہد کے باوجود مجھ سے ایسی دلیل کا مطالبہ کرتے رہیں "جس سے یہ ثابت ہو کہ حضرت معاویہؓ نے بیت المال کی رقوم اپنے ذاتی استعمال میں لانی شروع کر دی تھیں" تو میرے پاس اس کا کیا علاج ہے؟ مثالیں مزید بھی پیش کی جا سکتی ہیں مگر ان کا جواب بھی غالباً مدیر البلاغ "تبرعاً" یہی دیں گے جو وہ اب دے رہے ہیں کہ تین جمعے کے خطبوں میں امیر معاویہؓ یہ فرماتے رہے کہ ساری دولت ہماری دولت ہے، تو آخری جمعے میں ایک شخص نے کہا کہ مال تو سارا ہمارا ہے، جو شخص درمیان میں حائل ہو گا، ہم اس کا فیصلہ تلوار سے کرائیں گے۔ اس پر امیر معاویہؓ نے اس کو انعام دیا۔ نیز امیر معاویہؓ نے ایک خطبے میں بیت المال کے بقایا تقسیم کرنے کا اعلان فرمایا۔

یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہے کہ فلاں صاحب نے یہ اور یہ اچھے کام کیے تھے تو اب ان سے کوئی غلط فعل صادر نہیں ہو سکتا یا وہ ایسی ایسی فضیلت و منقبت کے مالک ہیں، اس لیے معصوم عن الخطاء ہیں۔ اِس طرزِ استدلال سے تو ہر ثابت و واقع غلطی کو کالعدم قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر دو ہفتے تک ہر شخص کی خاموشی کے بعد تیسرے ہفتے ایک شخص کا لب کُشا ہو سکنا جس سنگین صورت پر دلالت کرتا ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔

میرا سوال و اشکال پھر مولانا عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ "چوتھا اعتراض میں نے یہ کیا تھا کہ یہ مسئلہ عہدِ صحابہ ہی سے مختلف فیہ چلا آتا ہے کہ ذمی کی دیت مسلمان کے برابر ہوگی یا اس سے آدھی یا تہائی اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معاملے میں مختلف احادیث مروی ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے درمیانی راہ اختیار کرتے ہوئے متعارض احادیث میں تطبیق دی، آدھی دیت مقتول کے ورثاء کو دلوائی اور آدھی بیت المال کو۔ ملک صاحب نے اس کے مقابلے میں اپنے دلائل پیش کیے ہیں، لیکن ہمارے خیال میں یہ پوری بحث بالکل غیر متعلق ہے۔" اب یہ ایک عجیب و غریب صورتِ حال ہے کہ مولانا عثمانی صاحب نے یہاں میری بحث کے مرکزی پہلو کا نہ ذکر کیا ہے، نہ اس کا کوئی جواب ہی دینے کی کوشش کی ہے۔ بس اُسے غیر متعلق کہہ کر بیچ میں سے صاف اُڑا دیا ہے۔ ویسے تو میں نے ربیع الاول ۱۳۸۹ھ کے ترجمان میں دیت کے مسئلے پر پانچ صفحے لکھے ہیں لیکن آخری تین صفحوں میں میرا اصل اشکال و اعتراض واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے جس کی تردید میں ایک لفظ تک تازہ البلاغ میں موجود نہیں ہے۔ میرے لیے اور قارئین کے لیے یہ چیز اکتاہٹ کی موجب ہوگی کہ میں ساری بحث کو دہراؤں۔ تاہم میں بعض ضروری حصے دوبارہ مجبوراً نقل کرتا ہوں۔ میں نے مدیرِ البلاغ کا استدلال نقل کرنے کے بعد لکھا تھا:

"میں نے جہاں تک غور کیا ہے، امیر معاویہؓ کا یہ اجتہاد فی نفسہٖ نصوص کتاب و سنت کے خلاف ہے اور اس سے احادیث مختلفہ میں توفیق و تطبیق کی بھی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ سب سے پہلے قرآن مجید سے رجوع کیا جائے تو وہاں سورۂ نساء، آیت ۹۲ میں مومن اور کافرِ معاہد، دونوں کے قتلِ خطا کے معاملے میں دِیَۃٌ مُّسَلَّمَۃٌ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ قرآنی الفاظ کی مماثلت اور مساواتِ دیت کی روایات (مثلاً دیۃ ذمی کدیۃ مسلم، تتکافاء دماءھم وغیرہ) صحابہ و تابعین اور فقہاء مجتہدین کے اسی مسلک کی تائید کرتی ہیں کہ دونوں

دیتیں برابر ہیں اور امام سرخسی کے قول کے مطابق اس کے خلاف آثار پایہ صحت کو نہیں پہنچتے۔ تاہم اس امر سے مجالِ انکار نہیں کہ اس مسلک کے خلاف بھی روایات و آثار موجود ہیں، اس لیے بعض مذاہبِ فقہیہ نے کافر معاہد کی دیت کو مسلم کی دیت کا نصف یا ایک تہائی قرار دیا ہے لیکن قرآن مجید میں مسلم اور معاہد دونوں کی دیت کے متعلق مُسَلَّمَۃٌ اِلٰٓی اَھْلِہٖ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ مسلمان کی دیت ہو یا کافر معاہد کی، بہرحال وہ پوری کی پوری مقتول کے اہلِ خاندان کے حوالے کر دی جائے[1]۔ قرآن کا ارشاد اس معاملے میں بالکل ناطق اور صریح ہے جس میں اس تاویل کی قطعاً گنجائش نہیں کہ دیتِ مقررہ کا کوئی حصّہ مقتول کے وارثوں کے بجائے کسی دوسرے کے پاس جائے۔ اِلٰٓی اَھْلِہٖ کے الفاظ میں الی امیر المومنین یا الی بیت المال کا مفہوم آخر کس طرح داخل کیا جا سکتا ہے؟ اگر کسی تاویل یا کسی مصلحت کی رُو سے معاہد کی دیت کا کوئی حصّہ مسلمانوں کے بیت المال میں جا سکتا ہے تو پھر مسلمان کی دیت کا کوئی حصّہ کیوں نہیں جا سکتا؟ روایات و آثار میں دیتوں کے تناسب و مقادیر میں تو اختلاف ضرور مذکور ہے لیکن کوئی گری پڑی روایت بھی مجھے نہیں مل سکی جس میں یہ کہا گیا ہو کہ ذمّی یا معاہد کی دیت، خواہ وہ دیتِ مسلم کے مساوی ہو یا ½ یا ⅓، اس کا کوئی حصّہ بیت المال میں بھی جا سکتا ہے۔ . . . دیتوں کا اختلاف و عدمِ مساوات اور چیز ہے اور ان میں سے کسی جُز کا بیت المال میں جانا اور چیز۔ اس دوسری چیز کا ثبوت اگر امیر معاویہؓ کے سوا کسی اور سے ملتا ہو، تو اسے پیش کیا جانا چاہیے۔"

مدیر البلاغ نے اپنی پُرانی یا تازہ بحث میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا کہ کس دلیل شرعی کی بنا پر ذمی مقتول کے اولیاء کو دیتِ مقررہ کے کسی حصّے سے محروم رکھا جا سکتا ہے؟ انہوں نے سارا زور لنفسہٖ کو لبیت المال ثابت کرنے پر لگایا ہے۔ میں کہتا ہوں، چلیے تسلیم کر لیا کہ لنفسہٖ کا لفظ جن مؤرخین نے لکھا ہے ان کی مراد لبیت المال تھی، تب بھی دیت کے کسی حصّے کا بیت المال میں لینا کس رُو سے جائز ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح مسلمان کو کافر کا وارث بنانا صحیح نہیں، اسی طرح کسی مسلمان فرد یا بیت المال کو غیر مسلم کی دیت

[1] میں نے اس فقرے کو خاص طور پر جاذبِ توجہ کرنے کے لیے اس پر خط بھی کھینچ دیا تھا۔

میں حصہ دار بننا بھی درست نہیں۔ دیت ایک طرح کا ترکہ و ورثہ ہے جس کا مقتول کے اہل و اولیاء میں تقسیم ہونا واجب ہے۔ جس طرح مسلم و غیر مسلم کے مابین توارث ممنوع ہے اور کافر کا ورثہ کافر ہی کو ملتا ہے، اسی طرح کافر کی دیت، جو کچھ بھی ہو، وہ اس کے کافر وارثوں ہی کو ملتی ہے۔ ان دونوں معاملوں میں حضرت معاویہؓ سے یکساں غلطی ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مسلمان کی کافر سے توریث منقطع کر دی اور ذمّی کی دیت تو آدھی ہی رہنے دی مگر اتنی آدھی جو امیر معاویہؓ نے بیت المال کے لیے مقرر کی تھی اُسے موقوف کر دیا۔

علماء مفسّرین کی تشریحات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلم و غیر مسلم مقتول دونوں کی پوری دیت ان کے اولیاء کو ملے گی۔ اس کا کوئی حصّہ کسی دوسری جانب نہیں جا سکتا۔ سورۂ نساء کی آیتِ دیت کے جس جزء کا اطلاق معاہد یا ذمّی پر بھی ہوتا ہے، اس کی تفسیر میں امام ابنِ جریر کافر مقتول کے متعلق لکھتے ہیں:

لزمت قاتله ديته لان له ولقومه عهداً فواجب اداء ديته الى قومه للعهد الذى بينهم وبين المومنين وانها مال من اموالهم ولا يحل للمومنين شيءٌ من اموالهم۔

اس کافر مقتول کے قاتل پر اس کی دیت لازم ہے کیونکہ اس کافر اور اس کی قوم سے عہد کیا جا چکا ہے۔ پس اس کی دیت کا اس کی قوم کو ادا کیا جانا واجب ہے کیونکہ اس قوم اور مومنین کے مابین معاہدہ ہے اور یہ دیت کافر کے اہلِ قوم کے اموال میں سے ہے اور مومنین کے لیے ان کے مال میں سے کوئی شے بھی حلال نہیں۔

امام ابنِ جُریر کے اس ارشاد سے واضح ہو جاتا ہے کہ ذمّی کی دیت کے حقدار اس کے کافر اعزّہ ہیں، مسلمانوں کے لیے یہ مال حلال ہی نہیں ہے، خواہ وہ مسلمان افراد ہوں یا مسلمانوں کا بیت المال ہو۔ ابن جریرؒ نے اپنے اس قول کے حق میں متعدد دیگر اقوال بھی نقل کیے ہیں۔ بعض فقہاء نے ذمّی کی دیت بیت المال میں داخل کرنے کی صرف ایک شاذ صورت کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی ذمّی کے اولیاء میں سے کوئی بھی اگر موجود نہ ہو، تب اس کی دیت بیت المال میں لی جائے گی، ورنہ دوسری کسی حالت میں بھی اُسے بیت المال میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔ خود مدیر "البلاغ" محرم ۱۳۹۱ھ کے تازہ البلاغ میں اپنے مضمون بعنوان "اسلامی دستور کا مفہوم" کے ص ۱۰ پر لکھتے ہیں:

"غیر مسلم باشندگانِ مملکت کو (بشرطیکہ وہ مرتد نہ ہوں) بنیادی طور پر وہی انسانی حقوق حاصل ہوں گے، جو مسلمان باشندوں کو حاصل ہیں:

وَاِنْ کَانَ مِنْ قَوْمٍ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَھُمْ مِّیْثَاقٌ فَدِیَۃٌ مُّسَلَّمَۃٌ اِلٰٓی اَھْلِہٖ (۴ : ۹۲)

اور اگر (خطاءً قتل ہو جانے والا) ایسی قوم میں سے ہو جن کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہے (یعنی ذمی ہو) تو اس کے رشتہ داروں کو دیت سپرد کرنی ہو گی۔"

اسی آیت کی روشنی میں میری یہ گزارش ہے کہ جب قرآن مجید صاف طور پر بیان کر رہا ہے کہ ذمی کی دیت اس کے رشتہ داروں کو سپرد کرنی ہو گی، تو پھر اس کا کوئی حصہ بیت المال میں لینا کیسے جائز ہو گا اور اگر ذمی کے معاملے میں یہ جائز ہو گا تو مسلمان کی دیت کیوں پوری کی پوری اس کے رشتہ داروں کو دی جائے گی اور اس کا کوئی جزء بیت المال میں کیوں نہ لیا جائے گا؟ کیا مولانا عثمانی صاحب کے پاس میرے اس سوال کا کوئی جواب ہے؟ (باقی)

زکوٰۃ کے علاوہ

رفعِ احتیاج کی دیگر اسلامی تدابیر

(از یوسف القرضاوی — ترجمہ وتلخیص: عبدالحمید صدیقی)

(۱۲)

زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ دوسرے مالی حقوق ہیں جو مختلف اسباب وحالات کے تحت مسلمان پر واجب ہیں۔ اور ان سب کا مقصد بھی فقراء کی اعانت اور فقر واحتیاج کو دارالاسلام سے نکال باہر کرنا ہے۔ حقوق مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ہمسائے کا حق | ہمسائے کے حق کی حفاظت کرنے کا حکم خداوند تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں دیا ہے اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت میں ہمسائے کا حق ادا کرنے کی ترغیب دی ہے اور ہمسائے کی عزت واحترام کو ایمان کا تقاضا اور اس کی ایذا رسانی اور اس کے حقوق سے غفلت کو مسلمانی کے منافی قرار دیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ۔ (النساء۔ ۳۶)

اللہ کی بندگی کرو۔ کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور نیک سلوک کیا کرو اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں سے اور یتیموں اور مسکینوں اور قرابت دار پڑوسیوں اور اجنبی پڑوسیوں اور پاس کے بیٹھنے والوں سے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اُسے چاہیے کہ وہ اپنے ہمسائے کی تعظیم وتکریم کرے۔" (بخاری ومسلم)

(۲) اپنے ہمسائے سے حسنِ سلوک سے پیش آؤ مسلمان ہو جاؤ گے۔ (ابن ماجہ)

(۳) جبریل علیہ السلام مجھے ہمسائے کے بارے میں متواتر وصیت کرتے رہے حتیٰ کہ مجھے گمان گزرنے لگا کہ وہ اُسے ہمسائے کا وارث بنا دیں گے۔ (بخاری و مسلم)

(۴) وہ شخص مومن نہیں جو اس حال میں رات گزارے کہ وہ تو شکم سیر ہے اور اس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا ہے اور وہ یہ جانتا ہے۔ (طبرانی، بیہقی)

(۵) کسی علاقے کے رہنے والے لوگوں میں سے اگر کوئی شخص ایک رات بھی بھوکا رہے تو وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی حفاظت و امان سے نکل جائیں گے۔

عمدہ ترین بات جو ہمسائے کے حقوق کی حفاظت کے بارے میں آئی ہے وہ یہ ہے جو اس حدیث میں وارد ہے کہ "تو اپنے ہمسائے کو اپنے پکے ہوئے کھانے کی خوشبو سے تکلیف نہ دے الّا یہ کہ تو اُسے اپنے کھانے میں سے چلّو بھر دے دے۔ اور جب تو کوئی پھل خریدے تو اس میں سے اپنے ہمسائے کو تحفہ بھیج۔ اگر تو نہ بھیجنا چاہے تو اُسے چھپا کر اندر لے جا اور تیرا بچّہ اُسے لے کر باہر نہ نکلے مبادا اُسے دیکھ کر ہمسائے کا بچہ رنجیدہ ہو"۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "مجھے میرے دوست حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم نے وصیت فرمائی ہے کہ جب تو کچھ پکائے تو شوربا زیادہ کر لیا کر"۔

ہمسایہ صرف وہ نہیں جس کا گھر تمہارے گھر سے متصل ہو بلکہ آثارِ صحابہ میں یوں مروی ہے کہ چالیس گھر ہمسائے کی تعریف میں آتے ہیں۔ اور بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم نے کہا ہے کہ گھر کے چاروں اطراف میں سے ہر طرف کے چالیس چالیس گھر۔ لہٰذا ہر محلّے کے باشندے ایک دوسرے کے ہمسائے ہوئے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں "مَیں نے کہا اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! میرے دو ہمسائے ہیں ایک کے گھر کا دروازہ میرے گھر کے دروازے کے بالکل سامنے ہے اور دوسرے کا ذرا ہٹ کر۔ اور بعض اوقات میرے پاس انہیں دینے کے لیے کوئی چیز اتنی ہوتی ہے کہ دونوں کو نہیں دی جا سکتی اس صورت میں کونسا ہمسایہ مستحق تر ہے؟" آپؐ نے فرمایا "جس کا دروازہ تمہارے گھر کے دروازے کے سامنے ہے"۔

اسلام کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہر محلے کو ایک ایسی وحدت بنا دے جس کے اجزاء (یعنی باشندگانِ محلہ) خوشحالی اور تنگ دستی میں ایک دوسرے کی کفالت اور اعانت کریں۔ اپنے میں سے کمزور کا سہارا بنیں، بھوکے کو کھانا کھلائیں۔ ننگے کو کپڑا پہنائیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اللہ اور اس کا رسولؐ انہیں کوئی تحفظ نہیں دیتے اور وہ مومنین کے معاشرے سے منسوب ہونے کا استحقاق بھی نہیں رکھتے۔

اسلام کے آدابِ معاشرت میں ایک بہترین بات یہ ہے کہ اس نے ہمسائے کا ہمسائے پر حق رکھا ہے خواہ وہ غیر مسلم ہی ہو۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس تھا۔ اور اُن کا ایک غلام بھیڑ کو ذبح کر کے اس کی کھال اُتار رہا تھا تو آپؓ نے فرمایا "اے نوکر! جب تم کھال اُتار چکو تو پہلے ہمارے ہمسائے یہودی کو گوشت دینا"۔ یہ بات آپؓ نے کئی مرتبہ کہی۔ غلام نے آپ سے کہا "آپ یہ بار بار کیوں فرما رہے ہیں تو آپ نے فرمایا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ہمسائے کے متعلق وصیت فرماتے رہے حتی کہ ہمیں یہ خدشہ ہونے لگا کہ آپ ہمسائے کو ہمسائے کا وارث بنا دیں گے۔

۲۔ عیدالاضحیٰ کی قربانی | حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عیدالاضحیٰ کی قربانی مندرجۂ ذیل حدیث کے بموجب ہر خوشحال مسلمان پر واجب ہے:۔

من کان عندہ ساعۃ فلم یضح فلا یقربن مصلانا۔ (احمد۔ ابن ماجہ)	جو شخص خوشحالی کے باوجود قربانی نہیں دینا چاہتا وہ ہماری عیدگاہ کے قریب بھی نہ آئے۔

۳۔ قسم توڑنا | قسم شکنی کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے کہ فکفارتہ اطعام عشرۃ مساکین من اوسط ما تطعمون اھلیکم او کسوتھم او تحریر رقبۃ (قسم توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو یا انہیں کپڑے پہناؤ یا ایک غلام آزاد کرو)۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تب تین روزوں کا حکم ہے۔

۴۔ ظہار | جو شخص اپنی بیوی سے یہ کہہ دے کہ تو مجھ پر میری ماں یا بہن وغیرہ کی پُشت جیسی ہے تو وہ اس پر حرام ہو جاتی ہے تا آنکہ وہ شخص اپنی بات کا کفارہ ادا نہ کر دے اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کرے اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ متواتر دو مہینے کے روزے رکھے اور جو اس کی

بھی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

۵۔ ماہِ رمضان دن کے وقت جماع کرنا | ماہِ رمضان میں روزہ رکھ کر جماع کرنے کے مرتکب کو بھی وہی کفارہ ادا کرنا پڑے گا جو ظہار کے مرتکب پر فرض کیا گیا ہے۔

۶۔ بوڑھوں اور دائم المرض افراد کا فدیہ | وہ بوڑھے اور ناقابلِ علاج دائم المرض افراد جو ماہِ رمضان کے روزے نہیں رکھ سکتے وہ رمضان کے ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کے کھانے کے برابر کھانا فدیہ دیتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین (اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت تو رکھتے ہوں مگر (بوجہ عمر رسیدگی یا دائم المرضی) نہ رکھیں تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے)۔

حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو اپنی جان یا اپنی اولاد کی جان کا خطرہ ہو تو بعض فقہاء کے نزدیک وہ بھی فدیہ دے کر روزہ چھوڑ سکتی ہیں۔

۷۔ ہدی | وہ قربانی جو کوئی حاجی یا عمرہ کرنے والا اونٹ، گائے یا بکریوں کی صورت میں مندرجہ ذیل مقاصد کے لیے دیتا ہے:۔

ا۔ احرام کے سبب ممنوع افعال میں سے کسی فعل کے ارتکاب کے کفارے کے طور پر

ب۔ حجِ تمتّع (عمرہ اور حج دو احرام سے کرنا)

ج۔ حجِ قران (عمرہ اور حج ایک ہی احرام سے کرنا)

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ ۚ وَمَنْ قَتَلَهُ مِنْكُمْ مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءٌ مِثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسَاكِينَ ۔ (المائدہ: ۹۵)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو احرام کی حالت میں شکار نہ مارو اور اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر ایسا کر گزرے تو جو جانور اس نے مارا ہو اسی کے ہم پلّہ ایک جانور اُسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہوگا جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے اور یہ نذرانہ کعبہ

پہنچایا جاتے گا یا نہیں تو اس گناہ کے کفارہ میں چند مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا۔

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ (البقرہ: ۱۹۶)

جو شخص حج کا زمانہ آنے تک عمرے کا فائدہ اٹھائے وہ حسبِ مقدور قربانی دے۔

اس قربانی کے فرض کرنے سے شریعت کا مقصد یہ ہے کہ فقیر کو گوشت کھلانے کا موقع مہیا کیا جائے جس کی حکمت صاحبِ شریعت ہی جانتا ہے جو قربانی کی قیمت یا اس کی دُگنی قیمت بھی بطورِ صدقہ دے دینے کو قبول نہیں فرماتا۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ (حج: ۲۸)

اس قربانی میں سے خود بھی کھائیں اور تنگ دست محتاج کو بھی دیں۔

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔ (حج: ۳۶)

قربانی میں سے خود بھی کھاؤ اور ان کو بھی کھلاؤ جو قناعت سے بیٹھے ہیں اور ان کو بھی جو اپنی حاجت پیش کریں۔ ان جانوروں کو ہم نے اس طرح تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ تم شکریہ ادا کرو۔

۸۔ <u>فصل کی کٹائی کا حق</u> اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ جَنَّاتٍ مَعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أُكُلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ۔ (الانعام: ۱۴۱)

وہ اللہ ہی ہے جس نے طرح طرح کے باغ اور تاکستان اور نخلستان پیدا کیے کھیتیاں اگائیں جن سے قسم قسم کے ماکولات حاصل ہوتے ہیں، زیتون اور انار کے درخت پیدا کیے جن کے پھل صورت میں مشابہ اور مزے میں مختلف ہوتے ہیں۔ کھاؤ ان کی پیداوار جبکہ یہ پھلیں اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو۔

صحابہ اور تابعین رضوان اللہ علیہم کی ایک جماعت کی یہ رائے ہے کہ اس آیت میں "اللہ کے حق" سے

مراد زکوٰۃ نہیں بلکہ زکوٰۃ کے علاوہ کچھ دینا ہے جو فصل کے مالک کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ماحول میں غرباء و مساکین کی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جتنا چاہے دے دے۔ چنانچہ اس "حق" کی تفسیر میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد وہ عطیہ یا صدقہ ہے جو فصل کے مالک اپنی زکوٰۃ کے علاوہ دیں"۔

حضرت عطاء فرماتے ہیں "اس سے مراد یہ ہے کہ فصل کی کٹائی کے وقت فصل کے مالک جو آسانی سے دے سکیں وہ اُس وقت موجود غرباء و مساکین کو دے دیں اور یہ زکوٰۃ نہیں ہوگی"۔

حضرت مجاہد فرماتے ہیں "فصل کی کٹائی کے موقع پر آنے والے مساکین کو فصل میں سے جو دے دیا جائے"۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کی مذمت کی ہے جو اپنے باغوں کے پھل چُنتے ہیں اور اُن سے صدقہ نہیں دیتے جیسا کہ سورہ القلم میں مالکانِ باغ کا ذکر فرمایا ہے۔

فقیر اور مسکین کا حقِ کفایت | یہ حق دوسرے تمام حقوق سے زیادہ اہم ہے کیونکہ مسلم معاشرے میں ہر فرد کا یہ حق ہے کہ اُسے زندگی کی بنیادی ضروریات حسبِ کفایت مہیا کی جائیں اور اس کے کنبے کی کفالت کی جائے۔ اگر زکوٰۃ فنڈ سے یہ مقصد حاصل ہو جائے تو بہتر! اور اگر مالِ زکوٰۃ یا بیت المال کے دوسرے ذرائع آمدنی میں اتنی گنجائش نہ ہو کہ فقراء و مساکین اور اُن کے کنبوں کی کفالت بہتر طور پر کی جا سکے تو پھر مسلمانوں کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی فقراء و مساکین کا حق ہے جیسا کہ ترمذی میں فاطمہ بنت قیس سے روایت ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوٰۃ کے متعلق کچھ پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: "مسلمانوں کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی ایک حق ہے۔ پھر آپؐ نے سورۃ بقرہ کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَ	نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یومِ آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں

ـــه ملاحظہ فرمائیے سورۃ القلم از آیت ۱۷ تا ۳۳۔

السَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۔ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ۔ (البقرہ: ۱۷۷)

پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس آیت کو بطورِ استدلال پیش فرمایا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں پہلے خویش و اقارب، یتامیٰ اور مساکین کو مال عطا کرنے کو نیکی کہا گیا ہے۔ اس کے بعد اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے جو بجائے خود نیکی اور تقویٰ کے عناصر وارکان ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی خویش و اقارب اور مساکین وغیرہ کو کچھ دیتے رہنا واجب ہے۔

باوجود اس کے کہ یہ بات اتنی واضح ہے کہ کسی آیتِ قرآنی یا حدیثِ نبوی کو بطورِ استدلال پیش کرنے کی ضرورت نہیں تاہم قرآن و سنّت میں اس کے دلائل اظہر من الشمس ہیں کیونکہ نظامِ اسلامی کی ماہیت و مزاج جو قرآن و حدیث سے واضح ہوتا ہے اس کے مطابق اسلامی معاشرے میں کفالتِ باہمی ایک فرض کی حیثیت رکھتی ہے اور باہمی تعاون و ہمدردی ایک ایسا فرض ہے جسے ادا کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلم معاشرے کا نقشہ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ المومن للمؤمن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً[1] ۔ مومن باہم دگر دیوار کی مانند ہیں جس کے مختلف حصے ایک دوسرے کے لیے مضبوطی واستحکام کا باعث ہوتے ہیں)۔ اور مثل المومنین فی توادھم وتعاطفھم وتراحمھم کمثل الجسد الواحد اذا اشتکی منہ عضو تداعی لہ سائر الاعضاء بالحمی والسھر[2] (باہمی محبت، لطف و کرم اور رحم و رأفت میں مومنوں کی جماعت ایک جسم کی مانند ہے جس کا اگر ایک عضو مبتلائے درد ہوتا ہے تو دوسرے سارے اعضاء بخار اور بے خوابی کا شکار ہو کر اُس کے شریکِ درد ہو جاتے ہیں)۔ اور المسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا یسلمہ[3] (مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اس پر ظلم نہیں کرتا اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے)، اور ایما اھل عرصۃ اصبح فیھم امرؤ جائع فقد برئت منھم ذمۃ اللہ[4] (کسی علاقے کے رہنے والوں میں اگر ایک آدمی بھی رات کو بھوکا سو کر اٹھا تو وہ علاقہ اللہ کی حفاظت سے نکل جائے گا۔)

---

[1]، [2] بخاری و مسلم، [3] بخاری [4] حاکم

ان احادیثِ نبوی ؐ سے پہلے قرآن مجید کی آیات میں مسکین کو نظر انداز کرنے والوں اور فقیر اور نادار کو ظلم و ستم کا نشانہ بنانے والوں کو ہلاکت اور بربادی سے خبردار کیا گیا ہے اور دنیوی و اُخروی عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ چنانچہ سورۂ مدثر میں قرآن مجید آخرت کے مناظر میں سے ایک منظر پیش کرتا ہے، یعنی اصحابِ یمین کے اجتماع کا منظر جو اپنے باغات میں ہوں گے اور ایک دوسرے سے حق کا انکار اور تکذیب کرنے والوں کے متعلق پوچھ رہے ہوں گے اور جب وہ منکرین و مکذبین آگ کی لپیٹ میں آچکے ہوں گے تو وہ اصحابِ یمین اُن سے پوچھیں گے کہ یہ عذاب تم پر کس وجہ سے نازل ہوا ہے؟ وہ جواب دیں گے کہ مسکین کی حق تلفی کرنے اور اُسے بھوک اور عریانی کی حالت میں چھوڑ دینے کی وجہ سے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۝ إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ ۝ فِي جَنَّاتٍ يَتَسَاءَلُونَ ۝ عَنِ الْمُجْرِمِينَ ۝ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ (المدثر ۳۸-۴۴)

ہر ایک شخص اپنے اعمال کے بدلے گروی ہے مگر داہنے والے۔ باغوں میں ہوں گے باہم پوچھ رہے ہوں گے گنہگاروں کی نسبت۔ کس چیز نے ڈالا تمہیں دوزخ میں وہ کہیں گے کہ ہم نہ تھے نماز پڑھنے والوں میں اور نہ ہم کھانا کھلاتے تھے مسکینوں کو (اُن کے خورد و نوش، لباس، رہائش اور دیگر ضروریاتِ حاجاتِ زندگی کا خیال نہیں رکھتے تھے)۔

سورہ القلم میں اللہ تعالیٰ نے باغ والوں کا قصہ بیان فرمایا ہے جنہوں نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا کہ وہ رات کے وقت پھل توڑیں گے تاکہ اُن مساکین کو باغ کے پھلوں کے حصے سے محروم کر دیں جو کٹائی کے دن کچھ لینے کے لیے آجاتے تھے۔ ادھر انہوں نے ایک دوسرے سے یہ وعدہ کیا اُدھر اللہ کا فوری عذاب نازل ہوا۔ ارشادِ خداوندی ہے:

فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّن رَّبِّكَ وَهُمْ نَائِمُونَ ۝ فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ ۝ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِينَ ۝ أَنِ اغْدُوا عَلَىٰ حَرْثِكُمْ إِن كُنتُمْ صَارِمِينَ

وہ رات کو سو رہے تھے کہ بحکمِ خدا آگ نے سارا باغ جلا دیا جس سے وہ جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ صبح ہوتے ہی وہ ایک دوسرے کو پکارنے لگے کہ اگر تم کو باغ کا

فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْۤا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ...... كَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۔ القلم (۱۹-۳۳)

پھل توڑنا ہے تو سویرے ہی باغ میں چلو ۔ وہ چلے اور چپکے چپکے آپس میں کہہ رہے تھے کہ آج اس باغ میں تمہارے پاس کوئی محتاج نہ گھسنے پائے وہ سویرے ہی بڑے اہتمام کے ساتھ وہاں جا پہنچے اور دل میں سمجھتے تھے کہ وہ ضرور سب پھل توڑ لیں گے ۔ جب انہوں نے اس کو دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم تو راہ بھول گئے بلکہ ہم تو بد نصیب ہیں ۔ ۔ ۔ یونہی ہوا کرتا ہے عذاب اور آخرت کا عذاب تو کہیں بڑھ کر ہے کاش وہ جانتے (تو ایسا نہ کرتے) ۔

قرآن مجید نے صرف اس بات پر اکتفا نہیں کیا کہ مومنین کو مساکین معاشرہ کے خورد و نوش اور دیگر ضروریات زندگی کا خیال رکھنے کی دعوت دے اور ان کو بے سہارا چھوڑ دینے کی سزا سے ڈرائے بلکہ اُس نے ہر مومن پر مسکین کا یہ حق ڈالا ہے کہ وہ دوسرے مومن لوگوں کو بھی مساکین کے خورد و نوش کا انتظام کرنے اور ان کے دیگر حقوق کا خیال رکھنے کی ترغیب دے ۔ اور کہا ہے کہ مسکین کے حق کو پورا نہ کرنا اللہ تعالیٰ سے کفر کرنے کے مترادف ہے اور اُس کے غصے کا موجب اور آخرت میں جہنم کے عذاب کا باعث ہے ۔ چنانچہ اصحاب شمال (بائیں والے) کے بارے میں اللہ تعالےٰ سورہ الحاقہ میں فرماتا ہے :

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ مَاۤ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ ۔

لیکن جس کو اس کا اعمالنامہ اس کے بائیں ہاتھ میں ملے گا وہ کہے گا اے کاش! مجھے یہ میرا اعمالنامہ نہ ملا ہوتا اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے کاش! موت سے میرا بالکل خاتمہ ہی ہو جاتا میرا مال آج میرے کچھ بھی کام نہ آیا ۔ میری وہ دنیا کی حکومت آج مجھ سے کھوئی گئی ۔

پھر اللہ احکم الحاکمین ایسے مجرم کے متعلق اپنا عادلانہ فیصلہ دیتے ہوئے اُسے عذاب جہنم کا مستحق

قرار دے گا چنانچہ ارشاد ہوگا:

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ۔ (الحاقہ ۲۵-۲۹)

(اے فرشتو!) اسے پکڑ کر طوق پہنا دو۔ پھر اسے دوزخ میں پھینک دو۔ پھر ایک ستر گز لمبی زنجیر میں اسے جکڑ دو۔

پھر ان مجرمین کے لیے عذابِ جہنم کے قطعی حکم کی وجہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (الحاقہ: ۳۳-۳۴)

کیونکہ وہ بڑی عظمت والے خدا پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔

یہ وہ آیات ہیں جنہیں پڑھ کر دل کانپ اٹھتے ہیں اور ابو درداء رضی اللہ عنہ جیسا صحابی رسول اپنی بیوی سے یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اے اُمِ درداء! اللہ کے پاس ایک زنجیر ہے جسے اس وقت سے آگ کی بڑی بڑی دیگوں میں تپایا جا رہا ہے جب سے جہنم پیدا کی گئی ہے اور اس وقت تک تپایا جاتا رہے گا جب تک کہ وہ لوگوں کے گلے کا طوق نہیں بنا دی جاتی اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کے نصف سے اس وجہ سے نجات دے دی ہے کہ ہم اللہ عظمت والے پر ایمان رکھتے ہیں پس اے درداء کی ماں! مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیا کر۔"

قرآن مجید سے پہلے چشمِ کائنات نے کوئی کتاب ایسی نہیں دیکھی جس نے مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہ دینے کو جہنم رسیدگی اور عذابِ الیم کا موجب قرار دیا ہو۔

سورۂ ماعون میں اللہ تعالیٰ نے یتیم کو رنجیدہ کرنے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہ دینے کو تکذیبِ دین کی علامات کہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اَرَاَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (الماعون: ۱-۳)

کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو دینِ اسلام کو جھٹلاتا ہے یہی وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دے کر نکالتا ہے اور دوسروں کو بھی مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔

سورۃ الفجر میں اللہ تعالیٰ نے دورِ جاہلیت کے معاشرے کو ان الفاظ میں مخاطب کیا ہے:-

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ (الفجر ۱۷-۱۸)

ہرگز نہیں بلکہ تم ہی یتیم کی عزت نہیں کرتے اور نہ ایک دوسرے کو ترغیب دیتے ہو کہ مسکین کو کھانا کھلائیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تحاضون (باہم دگر ترغیب دینا) کے الفاظ فرما کر سارے معاشرے کو دعوت دی کہ وہ مسکین کی دیکھ بھال کے معاملے میں باہم دگر تعاون و ترغیب سے کام لیں۔

جب اصحابِ شمال، جاہلین اور دینِ اسلام (یا روزِ جزا) کی تکذیب کرنے والے مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتے اور اُسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تو پھر مومنین اور دین اسلام (یا روزِ جزا) کی تصدیق کرنے والوں پر فرض ہے کہ وہ فقراء و مساکین کی اعانت کریں خواہ انہیں دوسروں (یعنی جو لوگ سوسائٹی میں زیادہ مال و دولت والے ہیں اُن) سے مال لیکر اُن (فقراء و مساکین) کی اعانت کرنی پڑے مبادا وہ مذکورہ آیات میں نازل شدہ وعیدِ الٰہی کی زد میں آجائیں۔ یہ اعانت اُن فلاحی انجمنوں اور اجتماعی اداروں کے ذریعے کی جاسکتی ہے جو فقراء کی بہبود کے لیے بنائے گئے ہوں۔

ابنِ حزم کی رائے: جس شخص نے قرآن و سُنّت اور اقوالِ صحابہ و تابعین سے اس حق (فقراء و مساکین کا حق) کی کما حقہ وضاحت کی ہے وہ ظاہری فقیہ امام ابن حزم ہیں جو کہ اپنی فقہ میں قرآن و حدیث یا آثارِ صحابہ و تابعین کے نصوص کے ظاہر کو قابلِ اعتبار و اعتماد سمجھتے ہیں کسی امام یا فقیہ کی رائے یا قیاس کو نہیں مانتے۔ فقراء و مساکین کے حق کے سلسلے میں بھی انہوں نے قرآن و حدیث اور آثارِ صحابہ سے ایسی نصوص بھی پیش کی ہیں جو ثبوت کے اعتبار سے صحیح، اور تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور جن کے پیشِ نظر وہ پوری صاف گوئی سے اور بے لاگ طور پر یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے لازم ہے کہ ہر علاقے کے دولتمندوں پر زکوٰۃ کے علاوہ کچھ زائد ٹیکس لگائے جائیں تاکہ فقراء کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لیے کافی ہو سکیں۔ وہ بنیادی ضروریات یہ ہیں:

۱- خوراک جو اُس کے جسم کو تندرست و توانا رکھنے کے لیے کافی ہو۔

۲- لباس جو اس کی ستر پوشی کرسکے اور اس کے جسم کو گرمی یا سردی سے بچاسکے۔

۳- مکان جو اُسے گرمی، بارش اور راہ گیروں کی تانک جھانک سے بچاسکے۔

بعض فقہاء نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس وغیرہ لگانا جائز نہیں امام ابنِ حزم نے ایسے قطعی دلائل سے اس رائے کا توڑ کیا ہے کہ ردّ و اعتذار کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی چنانچہ اپنی تصنیف "المحلّٰی" میں رقم طراز ہیں:

ہر علاقے کے دولتمند افراد پر فرض ہے کہ وہ وہاں کے فقراء کے نان نفقہ کی ذمّہ داری قبول کریں اور اگر وہ ایسا کرنے سے گریز کریں تو حاکمِ وقت انہیں اس پر مجبور کرے۔ اگر زکوٰۃ اور مسلمانوں کے دوسرے مالوں (صدقہ وخیرات وغیرہ) سے اُن فقراء کی ضروریات پوری نہ ہو سکیں تو پھر اُن کی خاطر دولتمند مسلمانوں پر اتنا ٹیکس لگایا جائے جس سے اُن کی خوراک، لباس جو گرمیوں اور سردیوں کے لیے ہو، اور جائے رہائش جو انہیں بارش گرمی سردی، سُورج اور راہگیروں کی نظروں سے محفوظ رکھ سکے، کے لیے کافی ہو۔"

قرآنی دلائل | ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورۂ بالا قول کے قرآنی دلائل مندرجۂ ذیل ہیں:-

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ۔ (الاسراء: ۲۶)

رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ (النساء: ۳۶)

ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایہ سے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے، اور اُن لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضہ میں ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے مسکین اور مسافر کا حق رشتہ دار کے حق کے ساتھ مقرر فرمایا ہے اور والدین، قرابت داروں، مسکینوں اور ہمسایوں اور لونڈی غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک کو فرض کیا ہے اور حُسنِ سلوک کا تقاضا ہے کہ ان کی جملہ ضروریاتِ زندگی کا خیال رکھا جائے اور اُن کی ضروریاتِ زندگی کا خیال نہ رکھنا بلاشبہ بدسلوکی کے مترادف ہے۔

ارشاداتِ نبوی ﷺ | حضرت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلّم سے بہت سے طُرق سے نہایت صحت کے ساتھ

روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "جو روئے زمین کے انسانوں پر رحم نہیں کرتا اللہ اُس پر رحم نہیں کرتا"۔ جس شخص کے پاس اپنی ضرورت سے زائد مال ہو اور وہ دیکھے کہ اس کا مسلمان بھائی بھوکا ننگا ہے اور وہ اس کی مدد نہ کرے تو بلاشبہ اُس شخص نے اپنے بھائی پر رحم نہیں کیا۔

عبدالرحمٰن بن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اصحابِ صُفّہ فقیر قسم کے آدمی تھے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: جس شخص کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ تیسرے آدمی کو ساتھ لے جائے۔ اور جس کے پاس چار آدمیوں کا کھانا ہو وہ پانچویں یا چھٹے آدمی کو ساتھ لے جائے۔ اوکما قال

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اُس پر ظلم نہیں کرتا۔ اور اسے بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا"۔ ابو محمد فرماتے ہیں کہ جو شخص کھانا کھلانے اور کپڑا پہنانے کی قدرت رکھنے کے باوجود اپنے کسی بھائی کو بھوکا ننگا رہنے دے اُس نے اپنے بھائی کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس شخص کے پاس کوئی سواری زاید ہو وہ یہ زائد سواری اُس شخص کو دے دے جس کے پاس کوئی سواری نہیں اور جس کے پاس زائد زادِ راہ ہو وہ یہ زاید زادِ راہ اُس شخص کو دے دے جس کے پاس کوئی زادِ راہ نہیں"۔ ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ پھر آپؐ نے مال کی مختلف قسموں کا ذکر فرمایا حتیٰ کہ ہم سمجھے کہ اپنی ضرورت سے زاید مال میں ہمارا کسی کا بھی کوئی حق نہیں۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور قیدی کو رہا کرو"۔

قرآن مجید اور صحیح احادیث کی نصوص اس باب میں بہت زیادہ ہیں۔

آثارِ صحابہؓ حضرت ابو وائل شقیق ابن مسلمہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اگر مجھے اُس وقت اس بات کا علم ہو جاتا جو بعد میں ہوا ہے تو میں اغنیاء سے اُن کی ضرورت سے زائد مال لے لیتا اور اُسے مہاجر فقراء میں تقسیم کر دیتا"۔

حضرت علی ابن ابی طالب فرماتے ہیں " اللہ تعالیٰ نے اغنیاء کے مالوں میں فقراء کا جو حق مقرر فرمایا ہے وہ اتنا ہے جس سے فقراء کی ضروریات پوری ہوجائیں۔ اگر اس کے باوجود فقراء بھوکے ننگے رہیں اور اُن کا گزران مشکل ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اغنیاء اپنے مالوں میں سے فقراء کا حق ادا نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ یہ حق رکھتا ہے کہ ایسے اغنیاء سے قیامت کے دن مواخذہ کرے اور انہیں سزا دے۔"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں " تیرے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی ایک حق ہے۔"

حضرت ام المومنین عائشہؓ، حسن ابن علی اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت ہے۔ انہوں نے ایک سائل سے فرمایا " اگر تم بھاری خون بہا، کمر شکن قرض، رسوا کُن غربت کے سلسلے میں سوال کرتے ہو تو تمہارا حق واجب ہو گیا ہے۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراح اور تین سو دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق صحیح روایت ہے کہ اُن کے توشے ختم ہو گئے تو ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے توشے دو توشہ دانوں میں جمع کریں۔ جب انہوں نے جمع کر دیئے تو حضرت ابوعبیدہ انہیں اُس جمع شدہ توشے سے یکساں طور پر خوراک دینے لگے۔" حضرت شعبی، مجاہد، طاؤس وغیرہ کے متعلق صحیح روایت میں ہے وہ کہتے ہیں: مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔" اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے۔

ابنِ حزم فرماتے ہیں " ہمارے علم میں نہیں کہ صحابہ اور تابعین وغیرہ میں سے کسی نے اس کے خلاف کوئی بات کہی ہو سوائے ضحاک بن مزاحم کے جو کہتے ہیں " زکوٰۃ کے فرض ہونے کے بعد مال میں ہر دوسرا حق منسوخ ہو گیا ہے۔"

ابنِ حزم کہتے ہیں کہ ضحاک کی تو روایت ہی قابلِ حجت نہیں اُن کی رائے کیسے قابلِ حجت ہو سکتی ہے؟ اور عجیب بات یہ ہے کہ اسے بطور دلیل پیش کرنے والے ضحاک خود ہی اس کے پہلے مخالف ہیں اور ان کی رائے کے مطابق مال میں زکوٰۃ کے علاوہ مندرجہ ذیل حقوق ہیں:-

ضرورتمند والدین، بیوی، غلام اور حیوان پر خرچ کرنا اور قرضوں کی ادائیگی کرنا اور خون بہا وغیرہ ادا کرنا۔

شریعتِ اسلامی کے بُنیادی ضابطے

تصنیف: حسن احمد الخطیب المصری ـــ ترجمہ: جناب خلیل حامدی صاحب

(۴)

(فقہ الاسلام کا ایک باب)

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو: ترجمان القرآن شمارہ اکتوبر ۱۹۷۰ء)

بیسواں ضابطہ [1] "یُقدّم فی کل ولایۃٍ مَنْ ھو اقدر علی القیام بحقوقھا ومصالحھا"

(ہر منصب اور عہدہ کے لیے اُس شخص کو ترجیح دی جائے گی جو اُس کی ذمہ داریوں اور مصلحتوں کو پورا کرنے پر زیادہ قادر ہوگا)۔ چنانچہ اِس ضابطہ کی رُو سے مُلکی قیادت کے لیے اُس شخص کو مقدم رکھا جائے گا جو نظام کے انتظام و انصرام کو زیادہ بہتر طور پر سمجھتا ہو، شریعت کے مقاصد میں زیادہ درک رکھتا ہو، اہلِ تر افراد کے تقرّر اور ناموزون اور ضعفاء کی معزولی پر زیادہ قدرت رکھتا ہو، دشمنوں کے مقابلہ میں زیادہ جری ہو اور اسی طرح وہ مالی معاملات پر بھی گہری نظر رکھتا ہو اور اُسے یہ معلوم ہو کہ اموال کہاں کہاں سے حاصل کیے جا سکتے ہیں اور کن کن صحیح مدات پر صرف کیے جا سکتے ہیں۔ جنگی قیادت کے لیے اُس شخص کو ترجیح ہوگی جو جنگ کے حربوں میں زیادہ ماہر ہوگا، فوج کے نظم و نسق کو زیادہ بہتر طریقے سے سرانجام دے اور دشمن پر یلغار کرنے کی صلاحیت سے بہرہ مند ہو۔ عدلیہ کی ذمہ داری ایسے افراد کو سونپی جائے گی جو شرعی احکام کو بہتر جاننے والے ہوں اور مقدمہ کے فریقوں کے دلائل و بیانات اور اُن کے باریکیوں کو سمجھنے میں خوب ہوشیاری سے کام لیتا ہو۔

[1] الفروق للقرافی۔

اسی ضابطہ کے پیشِ نظر امامت میں اور جنگی معاملات میں اور دوسرے مناصب میں عورتوں پر مردوں کو ترجیح دی گئی ہے۔ کیونکہ عورتوں کی بہ نسبت مردان امور کی ذمہ داریوں اور مسئلحتوں کو زیادہ بہتر طریقے سے پورا کر سکتے ہیں۔ جب کہ تربیتِ اولاد کے معاملے میں مردوں کے بجائے عورتوں کو مقدم رکھا گیا ہے۔ اس لیے کہ عورتوں کے اندر بچوں کی عادات و خصائل کو برداشت کرنے کا زیادہ مادہ ہوتا ہے، وہ بچوں کے لیے زیادہ شفیق اور زیادہ رحمدل ہوتی ہیں، اور بچوں کی ناگوار باتوں پر کم ناک بھوں چڑھاتی ہیں۔[۵]

تیئیسواں ضابطہ "تصرّف الامام فی شئون الرعیۃ منوط بالمصلحۃ"[۳] (رعایا کے معاملات میں حاکم کے تمام تصرفات مصلحت پر مبنی ہوں گے)۔ اس ضابطہ کی بنیاد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے مال کے بارے میں میں نے اپنے آپ کو اُسی مقام پر رکھا ہے جو یتیم کے سرپرست کا ہے اگر ضرورت مند ہوتا ہوں تو اس میں سے کچھ لے لیتا ہوں اور جب کشادہ دست ہو جاتا ہوں تو واپس لوٹا دیتا ہوں اور اگر مستغنی ہوتا ہوں تو لینے سے کلی اجتناب کرتا ہوں"۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے اپنے گورنروں سے فرمایا: "بیت المال کے بارے میں میرا اور آپ سب کا وہی مقام ہے جو یتیم کے سرپرست کا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ (جو مالدار ہو وہ یتیم کے مال سے اجتناب کرے اور جو حاجتمند ہو وہ بھلے طریقے سے اس میں سے کچھ کھالے)۔

فقہائے اسلام نے بکثرت مقامات پر اس ضابطہ پر عمل کیا ہے۔ فقہاء کا قول ہے کہ "سلطان کے لیے درست نہیں ہے کہ وہ بیت المال کی زمین کو عوامی مصلحت کے سوا کسی اور کام کے لیے وقف کرے"۔[۱] فقہاء کا یہ قول بھی ہے کہ "سلطان ایسے قاتل کو معاف نہیں کر سکتا جس کا کوئی وارث نہ ہو، بلکہ سلطان کو اُس سے قصاص لینا چاہیے یا اُس پر دیت عائد کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ یہ حق عوام سے متعلق ہے۔ اور حاکم عوام کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اور جن چیزوں میں عوام کا مفاد ہو اُن کی حفاظت کرنا حاکم کا فرض ہے۔ لہذا یہ مناسب نہیں ہے کہ حاکم مفت میں عوام کے حق کو ساقط کر دے۔ مسلمانوں کے بیت المال کے بارے میں حاکم کی جو نازک ذمہ داریاں اور فرائض ہیں اس سلسلے میں امام زیلعی کا ایک تبصرہ ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں جس

---

[۵] الفروق للقرافی [۳] الاشباہ والنظائر [۱] الحموی

میں نہایت بلیغ درس دیا گیا ہے اور نہایت موثر نصیحت کی گئی ہے۔ امام زیلعی نے بیت المال کے اموال کی چار قسمیں بتانے کے بعد فرمایا ہے:

"امام کا یہ فرض ہے کہ وہ ان چاروں قسموں میں سے ہر ایک قسم کے لیے الگ الگ بیت المال مقرر کرے۔ اور ایک کو دوسری قسم کے ساتھ خلط ملط نہ کرے۔ اس لیے کہ ہر قسم کے لیے جداگانہ اور مخصوص احکام ہیں .... اور امام کو ہر وقت اللہ تعالیٰ سے لرزاں و ترساں رہنا چاہیے۔ اور ہر مستحق پر اُس کی ضرورت کے مطابق خرچ کرنا چاہیے۔ اس میں نہ زیادتی ہو اور نہ کمی۔ اگر امام نے اس معاملے میں کوئی کوتاہی کی تو بے شک اللہ تعالیٰ اُس سے پائی پائی کا حساب لے گا۔"

الاشباہ والنظائر میں ہے کہ "اگر عوام الناس کے معاملات میں سے کسی معاملہ کے اندر امام کا تصرف مصلحت کی بنیاد پر صادر ہُوا ہو تو اُس وقت تک وہ شرعاً نافذ نہیں ہو گا جب تک وہ فی الواقع مصلحت کے مطابق نہ ہو۔ اگر وہ مصلحت کے خلاف ثابت ہو تو اُسے نافذ نہیں کیا جائے گا۔"[۵] اسی ضابطے کی وضاحت میں امام قرافیؒ نے اپنی کتاب الفروق میں یہ قول نقل کیا ہے کہ "جو شخص بھی خلافت سے لے کر وصیت کی ذمہ داری تک کسی منصب پر براجمان ہوتا ہے اُس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ جلب منفعت اور ازالۂ مفسدت سے ہٹ کر کوئی تصرف کرے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر احسن طریقے سے) اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ من ولی من امور امتی شیئًا ثم لم یجتھد لھم ولم ینصح فالجنۃ علیہ حرام"[۶] (جو شخص میری اُمّت کے کسی کام کا نگران بنایا گیا اور پھر اُس نے لوگوں کی بہبود کے لیے کوئی تگ و دو نہ کی اور نہ ان کی خیر خواہی کا راستہ اختیار کیا تو اُس پر جنت حرام ہو گئی)۔

چوبیسواں ضابطہ | اذا تعارضت الحقوق قدّم منھا المضیق علی الموسع والفوری علی المتراخی

[۵] الاشباہ والنظائر، ص ۱۵۷ و ۱۵۸، ج اول طبع ۱۲۹۰ھ۔

[۶] الفروق للقرافی جزو چہارم، طبع تونس

وفرض العین علی الکفایۃ (جب مختلف حقوق میں تصادم ہو جائے تو تنگ کو کشادہ پر عاجلانہ معاملے کو غیر عاجلانہ معاملے پر اور فرض عین کو فرض کفایہ پر مقدم رکھا جائے گا) - اس ضابطے کی جزئیات یہ ہیں کہ اگر ایک شخص قرآن کی تلاوت کر رہا ہے اور اسی دوران اذان ہو جاتی ہے تو اُس شخص کو موذن کے کلمات کے اعادہ کو تلاوتِ قرآن پر ترجیح دینی چاہیے - کیونکہ اذان ختم ہونے کے ساتھ ہی ان کلمات کے دُہرانے کا وقت فوت ہو جائے گا جب کہ تلاوتِ قرآن کے لیے وقت کے فوت ہونے کا سوال نہیں پیدا ہوتا -
اسی طرح اگر کوئی شخص ڈوب رہا ہو یا آگ میں جل رہا ہو یا ایسی ہی کسی آفت میں گھر رہا ہو تو اُس کا بچانا نماز کی ادائیگی پر مقدّم ہو گا - یعنی اگر ایک شخص نماز شروع کر چکا ہے یا اس نے ابھی نماز شروع نہیں کی مگر وقت فوت ہو جانے کا اندیشہ ہے تو اُسے نماز قضا کر دینی چاہیے اور جس شخص کا بچانا ضروری ہو چکا ہے اُسے بچانا چاہیے[۵۴]

پچیسواں ضابطہ | "الاجتہاد لا ینقض الاجتہاد" (ایک اجتہادی فیصلے کو دوسرا اجتہادی فیصلہ منسوخ نہیں کرتا) - اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ دوسرا اجتہادی فیصلہ پہلے اجتہادی فیصلے سے زیادہ قوی نہیں ہوتا ہے - دونوں اجتہادی فیصلے مساوی درجہ کے ہوتے ہیں - اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر ایک اجتہادی فیصلہ کو دوسرا اجتہادی فیصلہ منسوخ کرتا رہا تو نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی کہ کوئی حکم یا فیصلہ اپنی جگہ پر برقرار نہ رہ سکے گا اور اس میں اُمّت کو شدید مشقت کا سامنا ہو گا -

الأشباہ والنظائر میں اس کی مثال یہ دی گئی ہے کہ اگر قبلہ کی صحیح سمت تعین کرنے میں نمازی کا پہلا اجتہادی فیصلہ بدل جائے تو وہ دوسرے اجتہادی فیصلہ پر عمل کرے - مگر اس کا پہلا فیصلہ بھی صحیح معتبر ہو گا یہاں تک کہ اگر اس نے چار رکعتیں چار مختلف سمتوں کی طرف پڑھیں اور ہر رکعت میں اُس کا اجتہادی فیصلہ تبدیل ہوتا رہا تو بھی یہ نماز صحیح ہو گی اور اُس پر کوئی قضا لازم نہ ہو گی - علیٰ ہذا القیاس اگر قاضی نے پہلے ایک فیصلہ دیا اور پھر اُس کے اجتہاد میں تبدیلی ہو گئی تو اس سے پہلا فیصلہ منسوخ نہیں ہو گا البتہ آئندہ وہ اپنے دوسرے اجتہاد کی بنیاد پر جو فیصلہ صحیح سمجھے گا صادر کرے گا -

---

[۵۴] الفروق [۵۵] حموی نے الاشباہ والنظائر کی شرح غمز عیون البصائر جلد اول میں بیان کیا ہے کہ بے شک ایک اجتہاد ؎

فقہائے کرام نے اِس ضابطہ کی توثیق میں یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے متعدد مسائل میں فیصلہ دیا تھا جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن کی مخالفت کی تھی۔ لیکن یہ اختلاف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فیصلوں کو منسوخ نہ کر سکا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بطریقِ صحیح مروی ہے کہ جب ان پر امورِ ریاست کا زیادہ ازدحام ہو گیا تو انہوں نے قضا کا منصب حضرت ابوالدرداء کو سونپ دیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ دو آدمی حضرت ابوالدرداء کے پاس جھگڑا لے کر آئے۔ آپ نے ان میں سے ایک کے حق میں فیصلہ دیا۔ جس شخص کے خلاف فیصلہ ہوا تھا وہ بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ امیرالمومنین نے اُس کا حال دریافت کیا۔ اُس نے جواب دیا کہ میرے خلاف فیصلہ کیا گیا ہے۔ امیرالمومنین نے فرمایا: اگر میں ابوالدرداء کی جگہ ہوتا تو تمہارے حق میں فیصلہ دیتا۔ اُس نے کہا: اب آپ کو اس فیصلے سے کس نے روکا ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: اس قضیے میں کوئی نص وارد نہیں ہے۔ اور جہاں تک اجتہادی رائے کا تعلق ہے وہ دونوں کی مساوی حیثیت رکھتی ہے" بلکہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے پہلے سال میراث کے ایک مسئلے میں جو "حجریہ" اور "مشترکہ" کے نام سے مشہور ہے[۹]۔ یہ فیصلہ فرمایا کہ سگے بھائی کو کچھ نہ دیا جائے۔ جب دوسرا سال آیا تو پھر آپ کے سامنے ایسا ہی مسئلہ پیش ہوا اور آپ نے وہی سابقہ فیصلہ صادر کرنا چاہا۔ اس پر سگے بھائی نے احتجاج کیا اور کہا کہ سوتیلے بھائی تو اپنی ماں کے ترکہ میں سے ثلث کے وارث ہو گئے حالانکہ وہ میری بھی ماں ہے۔ فرض کیجیے کہ ہمارا باپ کوئی گدھا تھا یا سمندر میں پھینک دیا جانے والا کوئی پتھر تھا لیکن کیا ماں ہم سب کو نہیں جوڑتی؟

دوسرے اجتہاد کا ناسخ نہیں ہے۔ اِلّا یہ کہ مصلحتِ عامہ اس کے نسخ کی متقاضی ہو (ص ۱۸۱)

[۹] وہ مسئلہ یہ ہے کہ ایک عورت اپنا خاوند، ماں، اخیافی بھائی، سگا بھائی یا سگے بہن بھائی چھوڑ کر مر جاتی ہے۔ ایسی صورت میں ترکے کا نصف خاوند، چھٹا حصہ ماں اور تہائی اخیافی بھائی لیں گے۔ سگے بہن بھائیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس لیے کہ تمام ترکہ ذوی الفروض میں تقسیم ہو گیا۔ بعض فقہاء کی یہی رائے ہے۔ لیکن راجح قول جس پر آج کل شرعی عدالتوں میں عمل کیا جاتا ہے یہی ہے کہ سگے بہن بھائیوں کو بھی اخیافی بھائیوں کے ساتھ تہائی حصہ میں شریک کیا جائے۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے اُسے بھی سوتیلے بھائیوں کے ساتھ ترکہ میں حصہ دار بنا دیا۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ پچھلے سال آپ نے جو فیصلہ دیا تھا وہ موجودہ فیصلے کے برخلاف ہے؟ مگر آپ نے فرمایا: اُس قضیے کے لیے ہمارا وہ فیصلہ تھا جو ہم کر چکے ہیں اور اس قضیے کے لیے ہمارا یہ فیصلہ ہے جو اب ہم کر رہے ہیں۔ دونوں اجتہادی فیصلوں میں سے ایک فیصلہ دوسرے کا ناقض نہیں ہے۔

چھبیسواں ضابطہ: لا اجتہاد عند ظهور النص (نص ظاہر ہو جانے پر اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں رہتی)۔

اللہ کے دین میں کتاب اللہ کی نصوص اور سنتِ ثابتہ کے خلاف فتویٰ جاری کرنا یا فیصلہ صادر کرنا حرام ہے۔ ابن القیم نے اس بات پر تمام علمائے امت کا اجماع نقل کیا ہے اور اس کی دلیل میں اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات بیان کیے ہیں:

۱۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (جب اللہ اور اس کے رسول نے کسی بات کا فیصلہ کر دیا ہو تو پھر کسی مومن مرد یا مومن عورت کو اس بارے میں اپنا اختیار استعمال کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ دُور کی گمراہی میں جا پڑے گا)۔

۲۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ("جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ لوگ کافر ہیں")

۳۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ("جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ لوگ ظالم ہیں")

۴۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ لوگ فاسق ہیں)۔

اللہ تعالیٰ نے ایک ہی مقام پر ایک بات کو بار بار اس لیے دُہرایا اور بار بار اس لیے یاد دہانی کرائی ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ اللہ کے نازل کردہ احکام کے خلاف فیصلہ کرنا فسادِ عظیم کا موجب ہے اس کا ضرر ہمہ گیر ہے اور اُمت کے لیے اس میں شدید تباہی اور ابتلاء ہے۔

روایات میں ہے کہ قبیلۂ ثقیف کا ایک آدمی حضرت عمر بن خطاب کی خدمت میں حاضر ہُوا اور اُس نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا کہ ایک عورت نے نحر کے دن طوافِ زیارت کر لیا اور پھر اُسے حیض آگیا تو کیا وہ (اگلے روز کی رمی کیے بغیر) کوچ کر سکتی ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: "وہ کوچ نہیں کر سکتی"۔ ثقفی نے کہا: ایسی ایک عورت کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے مجھے جو فتویٰ دیا تھا وہ آپ کے فتوے کے خلاف ہے۔" یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے اُٹھ کر اُسے دُرّے لگانے شروع کر دیئے۔ اور فرمانے لگے: جس چیز کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم صادر فرما چکے ہیں اُس کے متعلق تو نے مجھ سے کیوں فتویٰ پوچھا؟" حضرت عمر بن عبدالعزیز سے بھی ان کا یہ قول مروی ہے کہ جس سنت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرما دیا ہے اُس کی موجودگی میں کسی شخص کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔" امام شافعیؒ فرماتے ہیں: "تمام اُمّت کا اِس بات پر اجماع ہے کہ جس شخص پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی کوئی سُنّت واضح ہوگئی اُس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اُسے ترک کر کے کسی انسان کے قول کی طرف رجوع کرے۔ امام شافعی کا یہ قول بھی بتواتر مروی ہے کہ "جب صحیح حدیث مل جائے تو میرے قول کو اٹھا کر دیوار پر دے مارو۔"[۱۰]

ستائیسواں ضابطہ حکم الحاکم فی مسائل الاجتہاد یرفع الخلاف[۱۱] (اجتہادی مسائل میں حاکم کا فیصلہ اختلاف کو ختم کر دیتا ہے)۔

اٹھائیسواں ضابطہ[۱۲] توابع اور ضمنی امور میں جس بات کو معاف کیا جا سکتا ہے اصل امور میں وہ معاف نہیں کی جا سکتی۔ اسی سے ملتا جلتا علماء کا یہ قول ہے کہ بعض معاملات ایسے ہیں جن میں ضمناً چشم پوشی جائز ہے مگر قصداً جائز نہیں ہے۔

اُنتیسواں ضابطہ تابع کے لیے جُداگانہ حکم نہیں ہے۔ متبوع اگر ساقط ہو جائے تو اس کے ساتھ تابع بھی خود بخود ساقط ہو جائے گا۔ اگر اصل ساقط ہوگئی تو فرع بھی ساقط سمجھی جائے گی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ

---

۱۰ اعلام الموقعین جلد دوم ص ۲۰۸ تا ۲۱۰ طبع منیریہ

۱۱ الفروق للقرافی ۱۲ الاشباہ والنظائر

اگر اصل مقروض انسان کی براءت ہو گئی تو اس کے ضامن کی براءت خود بخود واقع ہو گئی۔ یہ ضوابط اکثر وبیشتر مسائل پر منطبق ہوتے ہیں۔ جامع اور کلی نہیں ہیں۔ بعض جزئیات پر دوسرے اسباب وعلل کی بدولت ان کا انطباق نہیں ہوتا[۱۳]۔

تیئیسواں ضابطہ صاحبِ شرع (قانون ساز ادارہ) کے کلام میں اگر دو مساوی درجہ کے احتمالات پائے جائیں تو اس کلام کو مجمل سمجھا جائے گا۔ اور ایک احتمال کو دوسرے احتمال پر افضلیت نہیں ہوگی[۱۴]۔

اکتیسواں ضابطہ مرجوح یعنی ضعیف احتمال الفاظ کی دلالت پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ ورنہ تمام عمومی احکام کی دلالت کا سقوط لازم آئے گا کیونکہ ہر ایک عمومی حکم کے اندر تخصص کا کسی نہ کسی درجہ احتمال ضرور موجود ہوگا[۱۵]۔

بتیسواں ضابطہ حتی الامکان کلام کو معمول بہ بنانا اُسے مہمل قرار دینے سے اولیٰ ہے۔ اور جہاں یہ کوئی امکان باقی نہ رہے وہاں بدرجۂ آخر کلام کو مہمل سمجھا جائے گا۔ اسی بنا پر اصولِ قانون کے ماہر علماء کہتے ہیں کہ اگر کسی کلام کا حقیقی مفہوم سمجھنا محال ہو جائے تو اُس کے مجازی معنی مراد لیے جائیں۔ اور اگر حقیقی اور مجازی دونوں میں سے کوئی معنی اس میں سے نہ نکلیں تو اُسے مہمل قرار دیا جائے کیونکہ اُس کے معمول بہ بنانے کا اب کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

اس ضابطے کی جزوی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حمل کا اقرار کرتا ہے مگر اس اقرار کا سبب بیان نہیں کرتا تو بعض فقہاء کے نزدیک اُس کے اقرار کو صحیح تسلیم کر لیا جائے گا۔ اور اُسے کسی درست سبب پر محمول کیا جائے گا، مثلاً یہ کہ وہ وراثت میں حصہ لینا چاہتا ہے یا وصیت میں شریک ہونا چاہتا ہے۔ یوں اُس کا کلام معمول بہ بن جائے گا۔ اور یہ اس سے بہتر ہے کہ اُسے مہمل قرار دیا جائے۔ اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ ایک شخص حلف اُٹھا کر کہتا ہے کہ وہ اس آٹے میں سے کچھ نہیں کھائے گا تو اگر اس نے اس آٹے کی بنی ہوئی کوئی چیز مثلاً روٹی کھالی تو اُس کی قسم ٹوٹ جائے گی اور وہ حانث ہوگا[۱۶]۔

---

۱۳ الاشباہ والنظائر۔ ۱۴ الفروق

۱۵ الفروق

۱۶ الاشباہ والنظائر جلد اول

علمائے اصول کا یہ قول بھی اسی قبیل میں سے ہے کہ التاسیس خیر من التاکید (تاسیس تاکید سے بہتر ہے) یعنی کسی کلام کو یہ سمجھنا کہ وہ کسی گزشتہ کلام کے اعادہ کے لیے وارد ہوئی ہے اس سے یہ بہتر ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ وہ کسی نئے مفہوم کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔ علمائے اصول کی مراد یہ ہے کہ بعض اوقات ایک جملہ یا ایک لفظ وارد ہوتا ہے۔ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ کسی سابقہ لفظ کی تاکید و توثیق کے لیے وارد ہوا ہو اور یہ احتمال بھی ہے کہ وہ نئے معنی کی طرف دلالت کرتا ہو جو اس کے علاوہ کسی اور لفظ سے ماخوذ نہ ہوتے ہوں۔ اگر ایسا جملہ یا لفظ دونوں احتمالات کے درمیان گردش کر رہا ہو اور کسی ایک احتمال کے لیے قوی ترجیح موجود نہ ہو تو اولیٰ یہ ہے کہ اُسے تاسیس پر محمول کیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ وہ کسی نئے مفہوم کے لیے وارد ہوا ہے۔

تینتیسواں ضابطہ: حرمت سے اباحت کی طرف منتقل ہونے کے لیے اعلیٰ درجہ کی شرائط درکار ہیں مگر اباحت سے حرمت کی طرف منتقل ہونے کے لیے ادنیٰ ترین سبب کافی ہے۔

شریعت کے اندر بکثرت ایسے احکام ملتے ہیں جو ان دونوں ضابطوں کی توثیق کرتے ہیں۔ مثلاً مسلمان کا خون بہانا حرام ہے۔ اس کے خون کی حرمت اُس وقت تک زائل نہیں ہو سکتی جب تک وہ کسی دوسرے شخص کو عمداً ناحق قتل نہ کرے، یا وہ شادی شدہ ہو کر زنا کا ارتکاب نہ کرے یا مرتد نہ ہو جائے۔ ازالۂ حرمت کے یہ تمام اسباب و شرائط اعلیٰ درجہ کے حامل ہیں۔ مگر دوسرے پہلو سے دیکھیے تو اگر قصاص کے ذریعہ قاتل کا خون مباح ہو جائے تو معاف کر دینے سے (جو کہ ادنیٰ ترین سبب ہے) دوبارہ حرمت قائم ہو جاتی ہے، اسی طرح ارتداد کی وجہ سے مباح کیا ہوا خون توبہ سے حرام ہو جاتا ہے (حالانکہ توبہ بھی ادنیٰ ترین سبب ہے)۔ رہا یہ مسئلہ کہ اگر زنا کا مرتکب بھی توبہ کر لے تو کیا اس کے خون کی حرمت لوٹ آتی ہے تو اس بارے میں علماء کے اندر اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ اُسے رجم کیا جائے گا اگرچہ اُس نے توبہ کر لی ہو (کیونکہ توبہ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے اور قانون ظاہری حالات پر فیصلہ کرتا ہے)۔ البتہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر باغی محارب گرفتار ہو جانے سے پہلے توبہ کر لے تو اس سے حد ساقط کر دی جائے گی[1]۔

[1] الفروق للقرافی۔ القیاس فی الشرع الاسلامی لابن القیم وابن تیمیہ۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ کسی غیر مرد کے لیے اجنبی عورت سے مقاربت کی حُرمت اس وقت تک زائل نہ ہوگی جب تک اُس کے ساتھ اُس کی اجازت سے گواہوں کی موجودگی میں عقد قائم نہیں ہو جاتا اور مہر کی پابندی عائد نہیں ہو جاتی۔ مگر جب عقد کے بعد عورت مرد کے لیے مباح ہو جاتی ہے تو اس اباحت کو ختم کرنے کے لیے مرد کی طرف سے طلاق کے معمولی الفاظ کا صادر ہو جانا کافی ہو جاتا ہے۔

کچھ ایسے مسائل بھی ہیں جو ان دونوں ضابطوں کے دائرے میں نہیں آتے مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔

چونتیسواں ضابطہ | اسباب الارث ثلاثة: زوجية وقرابة وولاء (وراثت کی بنیادیں تین ہیں: زوجیت، قرابت اور ولاء)۔ اس مسئلہ کا اصولی پہلو یہ ہے کہ وراثت کی بنیاد دو حیثیتیں رکھتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ ختم ہو سکتی ہے اور وہ زوجیت ہے جسے طلاق کے ذریعہ منہدم کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسری یہ کہ وہ ختم نہیں ہو سکتی۔ اس صورت میں بھی اُس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ بنیاد اغلب حالات میں دونوں طرف (یعنی اصل اور فرع) سے توارث کی متقاضی ہے یا دونوں طرف سے توارث کی متقاضی نہیں ہے۔ اگر دونوں طرف سے توارث کی متقاضی ہے تو وہ قرابت ہے اور اگر صرف ایک طرف سے توارث کی متقاضی ہے تو وہ ولاء ہے (کیونکہ ولاء میں اعلیٰ (آقا)، اسفل (غلام) کا وارث ہوتا ہے۔ اور اس کے برعکس اسفل اعلیٰ کا وارث نہیں ہوتا)۔

پینتیسواں ضابطہ | "من الحقوق ما ينتقل الى الوارث ومنها ما لا ينتقل" (کچھ حقوق ورثاء کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں اور کچھ نہیں منتقل ہوتے)۔

امام قرافیؒ فرماتے ہیں: "اس سلسلے میں ضابطہ یہ ہے کہ ورثاء کی طرف وہی حقوق منتقل ہوتے ہیں جن کا تعلق مال سے ہے یا جو وارث کی حیثیت عرفی کو نقصان سے بچاتے ہیں اور اُس کی تکلیف کو کم کرتے ہیں لیکن جن چیزوں کا تعلق مُورِث کی ذات، عقل و فہم، افکار و آراء اور صفات و خصائل سے ہے وہ ورثاء کی طرف منتقل نہیں ہوتیں کیونکہ ورثاء صرف مال کے وارث ہوتے ہیں، اس لیے وہ مال اور جو کچھ مال کے ضمن میں آتا ہے اُس کے وارث تو بن سکتے ہیں۔ مُورِث کی عقل اور مُورِث کی ذات اور اس سے وابستہ امور کے وارث نہیں بن سکتے۔ اس ضابطہ کی رُو سے مُورِث اپنی زندگی میں جن مختلف عہدوں

اور مناصب پر فائز تھا مثلاً امامت، خطابت اور وکالت (تفویض کردہ اختیارات)، وغیرہ، اُس کے مرنے کے بعد یہ عہدے اور مناصب ورثاء کو منتقل نہیں ہونگے۔ اسی طرح اگر مُورِث نے اپنی بیوی سے اِیلا کیا تھا تو اس کے وارث کو رجوع کا حق نہیں منتقل ہوگا۔ علیٰ ہٰذا القیاس مُورِث کے افکار و خیالات اور اُس کے مذہبی کاموں میں بھی وراثت نہیں جاری ہوگی۔

اس ضابطے کو تسلیم کرلینے اور اس کی صحت و راستی کا اعتراف کرلینے کے باوجود متعدد ائمہ نے بعض فروع کے اندر اس کی تطبیق میں اختلاف روا رکھا ہے۔ اور اس اختلاف کی بنیاد خود اس ضابطے کے دائرۂ اثر کی تشخیص میں اختلاف کا پایا جانا ہے۔ مثلاً امام ابوحنیفہ اور احمد بن حنبل رحمہما اللہ تعالیٰ کی یہ رائے ہے کہ خیارِ شرط کا حق بھی وارث کو منتقل نہیں ہوتا۔ یعنی اگر مُورِث نے بیع کے کسی معاملے میں کچھ شرائط کا اختیار حاصل کرلیا تھا تو اس کے بعد اس کے ورثاء کو یہ اختیار نہیں ملے گا۔ مگر امام شافعی اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ حق بھی ورثاء کو منتقل ہوجائے گا۔ اسی طرح شفعہ کا مسئلہ ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ شفعہ کا حق ورثاء کی طرف نہیں لوٹے گا لیکن بعض فقہاء مثلاً امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک شفعہ کا حق بھی ورثاء کو منتقل ہوجائے گا۔ اس اختلاف کا سبب درحقیقت یہ ہے کہ خیارِ شرط کے انتقال کا جو قائل ہے اس کے نزدیک خیار معاہدۂ بیع کی ایک صفت ہے اور جب معاہدے کے تمام متعلقات وارث کو منتقل ہوگئے تو معاہدے کی صفت بھی خود بخود منتقل ہوگئی۔ مگر امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا دونوں مسئلوں میں اختیار کا حق معاہدہ کرنے والے سے متعلق ہے کیونکہ یہ اُس کی مرضی اور انتخاب پر مبنی تھا۔ اور اُس کی وفات سے جس طرح اُس کی دوسری صفات اُس کے ساتھ ختم ہوگئیں ارادہ و انتخاب کی صفت بھی ختم ہوگئی۔[۵]

---

۵ الفروق

بیت المقدس کو یہودی شہر بنایا جارہا ہے!

(بقلم روحی الخطیب سابق میئر آف بیت المقدس)

[بیت المقدس کو خالصتہً یہودی شہر بنانے کے لیے اسرائیل نے جو منصوبے شروع کر رکھے ہیں وہ اب مخفی نہیں رہے ہیں۔ اخبارات میں روزانہ ان منصوبوں پر عملدرآمد کی خبریں آرہی ہیں اور انہیں رکوانے کے لیے ہر جگہ سے اپیلیں کی جارہی ہیں۔ خود اقوام متحدہ کے سکرٹری جنرل یوتھانٹ بھی اسرائیل کی ان کارروائیوں کی مذمت کر چکے ہیں اور انہیں اقوام متحدہ کی قراردادوں کے منافی قرار دے چکے ہیں۔ ذیل میں ہم بیت المقدس کے میئر جناب روحی الخطیب کی ایک رپورٹ کا خلاصہ نقل کر رہے ہیں جس میں موصوف نے اُس صہیونی منصوبے کے تمام پہلو منکشف کر دیئے ہیں جس کے تحت بیت المقدس کے اندر تمام اسلامی اور مسیحی آثار کو محو کیا جارہا ہے۔ اس رپورٹ کے ذریعہ سے روحی الخطیب صاحب نے دنیا کے مسلمانوں کو اپنے قبلۂ اول اور حرم ثالث کے تاریک مستقبل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ فہل من مجیب؟

——— خ ح]

اسرائیلی حکومت کی نگرانی میں بیت المقدس میں حرم ابراہیمی کے اردگرد جو کھدائیاں ہو رہی ہیں یہ عالمی یہودیت اور صہیونی تحریک کے تخریبی منصوبوں کی ایک کڑی ہیں۔ اس کڑی کے نفاذ کے ساتھ ساتھ دوسری کڑیاں بھی نافذ کی جارہی ہیں جن کی رُو سے بیت المقدس کی زمینوں پر قبضہ کیا جارہا ہے، وہاں دہشت گردی پھیلائی جارہی ہے، آبادی کے اندر اکھاڑ پچھاڑ کی جارہی ہے، مسلمانوں کے مقدس مقامات اور مدرسوں اور جائدادوں کو زمین بوس کیا جارہا ہے اور مسلمان آبادی پر ہجرت کے لیے دباؤ ڈالا جارہا ہے۔ حرم ابراہیمی

کو یہودی حکام کی تحویل میں دے دیا گیا ہے اور آثری کھدائیوں کے عنوان سے مسجدِ اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو منہدم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور ان دونوں تاریخی مسجدوں کے ارد گرد جو اسلامی آثار واقع ہیں انہیں توڑا پھوڑا جا رہا ہے اور ان کی جگہ عالمی یہودیت کا نیا ہیکل تعمیر کرنے کی اسکیم نافذ کی جا رہی ہے۔

یہودیوں کے ماہرینِ آثار اور مذہبی رہنماؤں نے حرمِ ابراہیمی کے ارد گرد ان کھدائیوں کے یہ مقاصد بیان کیے ہیں:

۱۔ حرم شریف کی جنوبی اور مغربی دیواروں کو کھودنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اس طرح سے دیوارِ گریہ کو منکشف کر سکیں جو ان کے نزدیک بڑی مقدس ہے اور مذہبی اہمیت کی حامل ہے۔

۲۔ کھدائیوں کے علاقہ میں جو مدرسے، مسجدیں، بازار اور رہائشی مکانات واقع ہیں خواہ وہ دیوارِ گریہ سے ملحق ہوں یا فاصلے پر، انہیں مسمار کر دیا جائے۔

۳۔ اس کے بعد وہ پورے حرم شریف کو لپیٹ میں لے لینا چاہتے ہیں اور اُس "عظیم ہیکل" کی دوبارہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں جس کا خواب وہ دو ہزار سال سے دیکھ رہے ہیں۔

ان کھدائیوں کے پسِ پردہ صہیونیت اور اسرائیل کے جو مقاصد پنہاں ہیں انہیں خود اسرائیل کے اخبار "یدیعوت" نے ۲۸ جنوری ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں اسرائیل کے وزیرِ مذاہب زیرح فارہفیک کی زبان سے واضح کر دیا ہے۔ یہ وزیر لکھتا ہے:

> "اسرائیل کی وزارتِ مذاہب زیرِ تجربہ کھدائیوں کے ذریعہ کوشش کر رہی ہے کہ دیوارِ گریہ کو پوری طرح عریاں کر دیا جائے۔ اور اس "قیمتی جوہر" کی سابقہ شان و شوکت بحال کی جائے۔ یہ کھدائیاں نہایت مقدس اور تاریخی کام ہے۔ اور تمام رکاوٹوں کے باوجود دیوارِ گریہ کو منکشف کیا جائے گا اور اس سے ملحق عمارتوں کو مسمار کر دیا جائے گا۔"

یہ کھدائیاں جون ۱۹۶۷ء کے بعد سے شروع ہو گئی تھیں اور اب تک برابر جاری ہیں۔ ان کھدائیوں نے حرم شریف کے جنوب اور مغرب میں حرم کی دیواروں سے متصل تمام چیزوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ مسجدِ اقصیٰ کی جنوبی دیوار کے نیچے سے ان کھدائیوں کا آغاز کیا گیا تھا اور حرم شریف کے جنوبی زاویہ

تک دیوار کے ساتھ ساتھ انہیں پھیلا دیا گیا۔ اس کے بعد دیوار کے ساتھ ساتھ شمال کی جانب اُن کا رُخ کر دیا گیا اور حرم شریف کے باب المغاربہ تک انہیں پھیلا دیا گیا۔ مغربی دیوار میں بھی جگہ جگہ کھدائیاں کی گئی ہیں۔ شرعی عدالت کی قدیم عمارت کے نیچے بھی کھدائیاں جاری ہیں جو باب السلسلہ کے نیچے سے شمالی جانب کی طرف بڑھائی جا رہی ہیں۔ یہ کھدائیاں وقف عمارتوں کے نیچے سے گزرتی ہیں اور حرم شریف کے پانچ دروازوں (باب السلسلہ، باب المطہرہ، باب القطانین، باب الحدید اور باب علاء الدین البصیری) کو لپیٹ میں لے رہی ہیں۔

اسرائیلی علمائے آثار نے مجوزہ کھدائیوں کا طول ۴۸۵ میٹر بیان کیا ہے۔ اور اب تک ان میں سے ۲۳۰ میٹر کی کھدائیاں عمل میں آچکی ہیں ملاحظہ ہو اسرائیلی اخبار "معاریف" شمارہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۰ء۔ اسی اخبار کا یہ بیان ہے کہ اسرائیل کی وزارتِ مذاہب کے ملازمین عربوں کے رہائشی مکانات کے نیچے بھی کھدائیاں کر رہے ہیں۔ اور کھدائی کرنے والوں نے اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ ان کھدائیوں سے مکانات میں شگاف پڑ جانے کا امکان ہے۔ یہ کھدائیاں آج تک تین مراحل سے گزری ہیں۔

پہلے مرحلے میں صرف اسلامی اوقاف کے اس سفید قطعہ پر کھدائی کی گئی جس پر کوئی مکان نہیں تھا۔ یہ قطعہ مسجد اقصیٰ کی جنوبی سمت، اسلامی میوزیم کی عمارت کی دیوار اور فخری منارہ سے لے کر حرم شریف کے جنوب مغربی زاویہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس جگہ کھدائی کی گہرائی دس میٹر بتائی گئی ہے۔ امریکہ کے اثری عالم پروفیسر کیمپ نے بیت المقدس میں امریکی نمائندے کو ایک عرضداشت ۱۱ اپریل ۱۹۶۸ء کو پیش کی جس میں اُس نے بتایا کہ اس مرحلہ میں جو کھدائیاں کی گئی ہیں انہیں معمولی مزدوروں نے سرانجام دیا ہے جن کی تعداد ۲۵ ہے۔ اور ان کے ساتھ عبرانی یونیورسٹی کے طلبہ اور رضاکار کام کرتے رہے ہیں۔ اور مزید برآں یہ کہ نگرانی کرنے والے بھی نااہل ہیں۔ عبرانی یونیورسٹی کے شعبۂ آثار کے مدیر نے یہ اعتراف کیا ہے کہ ان کھدائیوں کا نگران زیرِ زمین کھدائیوں کا قطعاً تجربہ نہیں رکھتا۔ اس کی یہ کوشش نہایت قیمتی آثار کو برباد کر کے رکھ دے گی (امریکی پروفیسر کا اشارہ مسجد اقصیٰ، اسلامی میوزیم اور فخری منارہ کی عمارتوں کی طرف ہے)۔ دوسرے مرحلہ میں یہ کھدائیاں زاویۂ فخریہ اور حرم شریف کے باب المغاربہ کے درمیان واقع وقف

املاک کے نیچے جاری کی گئیں۔

بیت المقدس پر جب اسرائیل نے قبضہ کیا تو اس وقت دیوار گریہ کا صرف ۵۰ میٹر حصّہ ننگا تھا۔ اس حصّہ کو یہودی دیوارِ گریہ کہتے ہیں اور مسلمانوں میں یہ "دیوارِ براق شریف" کے نام سے مشہور ہے (متعدد روایات کے مطابق اس جگہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سفرِ معراج کے موقع پر اپنا براق باندھا تھا)۔ براق شریف دراصل حرم شریف کی ہی ایک دیوار ہے۔ اور یہ اسلامی وقف میں شامل ہے۔ بین الاقوامی برطانوی کمیشن نے دسمبر ۱۹۳۰ء میں اپنی رپورٹ میں اس دیوار کے اسلامی وقف میں شامل ہونے کی تصدیق کی تھی۔ اس کے بعد یہودیوں کو اس دیوار پر کوئی حقِ ملکیت نہ تھا۔ البتہ مسلمانوں نے رواداری کے طور پر یہودیوں کو یہاں آکر رونے دھونے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اور اُس وقت سے یہودیوں نے اس کا نام "دیوارِ گریہ" رکھ دیا۔

۱۴ رجون ۱۹۶۹ء کو یہ کھدائیاں بہت گہری کر دی گئیں جس کی وجہ سے ان کے اوپر واقع مکانات (یعنی زاویہ فخریہ، ایک مسجد اور ۱۴ وقف مکانات جن میں قدیم مقدسی خاندان رہتے تھے) کے اندر شگاف پڑ گئے۔ اسرائیلی حکّام نے یہ صورتِ حال دیکھ کر ان مکانات کو فوری طور پر خالی کر دینے کے احکام جاری کر دیئے اور ان مکانات کو منہدم کر دیا۔ اور یوں اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب و تمدّن کے آثار آنکھوں دیکھتے ملیامیٹ ہو گئے۔ اردن کے وزیرِ اعظم کے ایک میمورنڈم کے مطابق جو لیوایں او کو بھیجا گیا تھا دیوارِ گریہ کے اتنے حصّے کے انکشاف کے لیے ۳۵ مکانات منہدم کیے گئے۔ ۶۵۰ افراد کو گھروں سے بیدخل کیا گیا۔ ملحقہ آبادیوں کی ۵۹۵ جائدادوں کو ضبط کیا گیا۔ ان ضبط شدہ جائدادوں کے باشندوں کو بھی نکالنے کے لیے طرح طرح کی زیادتیاں کی گئیں اور آخر کار ۹۳ مزید خاندانوں کو گھروں سے نکال دیا گیا اور اُن کے گھر منہدم کر دیئے گئے۔ اس صورتِ حال نے عرب باشندوں کے اندر شدید خلفشار اور قلق پیدا کر دیا۔

تیسرے مرحلے پر اسرائیلی حکّام نے دیوارِ گریہ کا بقیہ حصّہ ننگا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کا آغاز اس خبر سے ہوا جو ۱۵ رجولائی ۱۹۶۹ء کو ہیرلڈ ٹریبیون میں نشر کی گئی۔ خبر کا عنوان تھا: "دیوارِ گریہ کو منکشف کر دیا جانا چاہیے"۔ اس میں ٹریبیون نے لکھا تھا کہ بیت المقدس میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ دیوارِ گریہ جو ہزار

سال کے بعد پہلی مرتبہ مکمل طور پر منکشف کی جا رہی ہے۔ یہ دیوار ہیکل سلیمانی کی مغربی دیوار کا باقیماندہ حصہ ہے۔ یہ ہیکل شاہنشاہ ہیروڈوس کے عہد میں تعمیر کیا گیا تھا اور ۷۰ء میں رومی فوجوں نے اُسے مسمار کر دیا اور اب دوبارہ اس کی بنیادیں تلاش کی جا رہی ہیں" چنانچہ اس نئے منصوبے کو نافذ کرنے کے لیے ۶ نئے اسلامی اور عربی محلّوں کو لپیٹ میں لیا جا رہا ہے۔ ان محلّوں میں تقریباً ۲ سو عرب جائدادیں اور اسلامی آثار نشانہ بنیں گے۔ اور ۳ ہزار افراد کو مزید گھروں سے بے گھر کرنا ہوگا۔ اِن جائدادوں کے نمایاں حصے یہ ہیں:

۱۔ وہ تاریخی مسجد جس میں شریفِ مکہ حسین بن علی کی قبر ہے اور محلہ باب الحدید میں واقع ہے۔

۲۔ ایک اور تاریخی مسجد جس میں مولانا محمد علی جوہر کی قبر ہے۔ یہ مسجد باب القطانین اور باب الحدید کے درمیان واقع ہے۔

۳۔ حرم شریف کے اردگرد متعدد اسلامی اور تاریخی درسگاہیں جو مسلمان حکمران وقتاً فوقتاً قائم کرتے رہے ہیں

۴۔ دو تاریخی حمام جو فنِ تعمیر اور عربی روایات کا نادر نمونہ ہیں

۵۔ القطانین بازار۔

۶۔ قاتیبائی کا زاویہ۔ اس زاویہ میں ایک مسجد اور کئی تاریخی مکانات واقع ہیں۔

۷۔ شرعی عدالت کی قدیم عمارت۔ تاریخی طور پر یہ عمارت مدرسۂ تنکیزیہ کے نام سے معروف ہے۔ اور اب اس میں بیت المقدس کا شریعت کالج واقع ہے۔

یہ تمام آثار اور مقامات بیت المقدس کی عربی اور اسلامی حیثیت کی ٹھوس علامتیں ہیں۔ اور اسلامی تاریخ و تہذیب کے زندہ نمونے ہیں۔ ان کو ختم کر دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ بیت المقدس کی اسلامی حیثیت کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ میں نے یہ صورتِ حال دیکھ کر حکومتِ اردن اور دوسری تمام عرب اور مسلمان حکومتوں کو ایک عرضداشت کے ذریعہ اس سے مطلع کر دیا تھا۔ چنانچہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو یونیسکو کی طرف سے ان کھدائیوں پر اسرائیل کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا۔ مگر اسرائیل نے اس احتجاج کی پروا نہیں کی۔ اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو اسرائیلی اخبار "معاریف" میں یہ خبر شائع ہوئی کہ کھدائیوں کا کام برابر جاری

ہے ۔ اور اسرائیلی علمائے آثار اب تک ۴۸۵ میٹر میں سے ۲۳۰ میٹر کی کھدائی کر چکے ہیں ۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو ان کھدائیوں میں دیوار گریہ کا سب سے بڑا پتھر دریافت ہوا جس کی لمبائی ۱۱ میٹر اور ۲۰ سنٹی میٹر ہے اور موٹائی ۳ میٹر اور ۴۰ سنٹی میٹر ہے ۔ اور ۴۰۰ سو ٹن اس کا وزن ہے ۔"

بیت المقدس کے دوسرے اسلامی آثار اور مقامات کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جا رہا ہے بیت المقدس کا مشہور وقف جو "وقف ابو مدین الغوث" کے نام سے مشہور ہے سب سے پہلے اسرائیلی حکام نے اُسے منہدم کیا ۔ اس وقف میں ۱۳۵ جائدادیں تھیں جن میں ۲ مسجدیں تھیں ۔ اس میں ۶۵۰ افراد رہتے تھے جو المغرب (مراکش) سے تعلق رکھتے تھے ۔ یہ لوگ مدتوں سے حرم ابراہیمی کے جوار میں مقیم تھے ۔ اس لیے یہ آبادی محلہ المغاربۃ کے نام سے موسوم تھی ۔ اسرائیلی حکام نے دیوار گریہ کا ماحول کشادہ کرنے کے بہانے سے اس پورے محلّے کو زمین بوس کر دیا ۔ بیت المقدس کا ایک دوسرا بڑا محلہ بھی اسی تخریبی کارروائی کی نذر ہو چکا ہے ۔ اس محلے کا رقبہ ۱۱۶ دونم ہے (ایک دونم ایک ہزار میٹر مربع کے برابر ہوتا ہے) اس میں ۵۹۵ اسلامی جائدادیں تھیں جن میں ۱۰۴۸ رہائشی مکانات ، ۴۳۷ مخزن ، ۴۰ مدرسے ، ۵ مسجدیں اور ۳ بازار تھے ۔ اور اس کی آبادی ۶ ہزار مسلمانوں پر مشتمل تھی ۔ اسرائیل حکام نے ۱۴ اپریل ۱۹۶۸ء کو اس پورے محلّے کو ضبط کر لیا ۔ اردنی حکومت نے اس کے خلاف فوراً سلامتی کونسل کو لکھا ۔ سلامتی کونسل کی طرف سے ۲۱ مئی ۱۹۶۸ء اور ۳ جولائی ۱۹۶۹ء کو دو قراردادیں اس ظلم کے خلاف صادر ہوئیں ۔ مگر اسرائیل نے سُنی ان سُنی کر دی ۔ چنانچہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں یہودی اخبار "ھارتس" میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ مذکورہ بالا محلے کے لوگوں پر برابر دباؤ ڈالا جا رہا ہے ۔ ان میں سے ۳ ہزار کے قریب لوگ نکل گئے ہیں محلّے کے کچھ حصے کو منہدم کر دیا گیا ہے ۔ اور کچھ حصے میں یہودی خاندان آباد کر دیئے گئے ہیں جن کی تعداد ۲۵۰ افراد تک ہے ۔ اس محلے میں حکومت ۶۰۰ رہائشی کوارٹر تعمیر کر رہی ہے جن کے ساتھ دو اسکول ہوں گے اور ایک یہودی عبادت گاہ ۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء کے معاریف اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ اسرائیلی حکام نے اسلامک سنٹر کو گرانے کا فیصلہ کر دیا ہے ۔ یہ سنٹر مسجد اقصیٰ سے ۲۰ میٹر کے فاصلے پر واقع ہے ۔ یہ سنٹر دراصل "اقصیٰ گرلز کالج"

تھا جو بیت المقدس کے محکمۂ اوقاف کے تابع تھا۔ ۵ رجون ۱۹۶۷ء سے پہلے تک یہ باقاعدہ قائم تھا اور اس میں ۶ سو عرب بچیاں زیر تعلیم تھیں۔ اسرائیل نے بیت المقدس پر قبضہ کرتے ہی اس مدرسہ کو بند کر دیا اور اسے یہودیوں کے "مذہبی مرکز" میں تبدیل کر دیا۔ اور اُسے "بیت الدین الاسرائیلی" کا نام دے دیا۔ لیکن اب اس عمارت کو بھی گرایا جا رہا ہے۔

پیچھے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ سلطان تنکیز مرحوم کے قائم کردہ مدرسہ کو بھی گرا دیا گیا ہے۔ جس علاقہ میں یہ مدرسہ واقع ہے اُس میں ۱۷ اسلامی عمارتوں کو مسمار کیا گیا ہے۔ سلطان تنکیز کا مدرسہ جو شرعی عدالت کے نام سے مشہور ہے اس میں ایک اسلامی درسگاہ تھی اور آخری دنوں میں اس کے اندر مؤتمر اسلامی کا دفتر تھا۔ یہ بُراق شریف کی دیوار اور باب السلسلہ کے درمیان واقع ہے۔

حرم شریف کے مغربی صدر دروازے کی ڈیوڑھی اور اس سے متصل مزید ۱۶ عمارتیں مغربی کنارے کے اسرائیلی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے حکم سے ضبط کر لی گئی ہیں۔ اسی طرح الخضراء کا علاقہ بھی زیر زمین کھدائیوں کی وجہ سے خطرے میں مبتلا ہو چکا ہے۔

بیت المقدس کا مشہور قبرستان جس میں ہزاروں نامور مسلمان مدفون ہیں۔ ان میں صحابہ اور مجاہدین بھی ہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد اور پھر صلاح الدین ایوبی کے عہد میں جہاد میں شریک ہوئے۔ ان میں حضرت عبادہ بن صامت اور حضرت شدّاد بن اوس انصاری بھی ہیں۔ یہ پورا قبرستان اور اس سے متصل علاقہ وقف جائداد ہے اور اب اسے بھی اسرائیل کی طرف سے ضبط کیا جا رہا ہے۔ یہودی اخبار "دہارتس" کی ۲۶ فروری ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ قبرستان اور بیت المقدس کی فصیل سے ملحقہ علاقے میں تفریحی پارک بنائے جا رہے ہیں۔ خبر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسرائیل کی وزارت قانون نے بھی یہ اجازت دے دی ہے۔ اس علاقہ میں دو قبرستان ہیں۔ ایک "قبرستان باب الرحمت" اور دوسرا "یوسفی قبرستان"۔

اخبار القدس کی ۲۰ راگست ۱۹۷۰ء میں یہ اعلان شائع ہوا ہے کہ اسرائیل کی تعمیر اور منصوبہ بندی کمیٹی نے قدیم بیت المقدس اور اس کے مضافات میں نئے تعمیری منصوبے کی منظوری دے دی ہے۔ یہ

منصوبہ دو حصّوں پر مشتمل ہے ۔ ایک حصہ بیت المقدس کے داخلی حصّہ میں نئی تعمیرات کے لیے ہے اور دوسرا شہر کی فصیل کے باہر نئی بستیاں بسانے کے متعلق ہے ۔ یہ منصوبہ اتفاق رائے سے منظور ہو گیا ہے ۔ اور اس سے ۱۰ ہزار دونم اراضی اور ۵۰ ہزار باشندے متاثر ہوں گے ۔ اس طرح گویا اسرائیل بیت المقدس کے اصل شہر کو توڑ پھوڑ کر اُسے نئے سر سے یہودی شہر بنانے کی کوشش کر رہا ہے ۔

مطبوعات

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

انوار السنن | افادات مولانا قاضی عبید اللہ صاحب نقشبندی مفتی ڈیرہ غازی خاں۔ ترتیب: قاضی شمس الدین علوی مدرس عبیدیہ نقشبندیہ ڈیرہ غازی خاں۔ ناشر: دار العلوم عبیدیہ بلاک ڈیرہ غازیخاں۔ (مغربی پاکستان)۔ ہدیہ پانچ روپے پچاس پیسے۔ صفحات ۲۴۰۔

احادیثِ نبویؐ کا یہ قابلِ قدر مجموعہ بلوغ المرام کی طرز پر مرتب کیا گیا ہے۔ فاضل مؤلف نے حنفی مسلک کے کئی مسائل جنہیں اہلِ حدیث حضرات سُنّت کے نقطۂ نظر سے کمزور سمجھتے ہیں اُن کی تائید سنتِ نبوی سے کی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے دوسرے مسائل جن کے بارے میں لوگوں کے ذہن صاف نہیں ان کے بارے میں مختلف احادیث کو بیان کیا ہے، یہ کوشش قابلِ قدر اضافہ ہے مگر دو چیزیں اس میں کھٹکتی ہیں۔ ایک تو ایسی کتاب کے اندر طنز نہیں جچتی اور اگر یہ ناگزیر ہو تو اس کا انداز بہتر اور شائستہ ہونا چاہیے۔ دوسرے کتاب کی ترتیب و تدوین زیادہ کاوش اور عرق ریزی کی متقاضی ہے۔

معیار طباعت و کتابت بھی گوارا ہے۔

کتابتِ حدیث عہدِ نبویؐ | تالیف جناب پروفیسر ابوبکر غزنوی صاحب۔ شائع کردہ مکتبۂ غزنویہ ۴ شیش محل روڈ، لاہور۔ صفحات ۳۲۔ قیمت درج نہیں۔

فاضل مصنّف کی زیرِ نگرانی تحریکِ احیائے دین نے چھوٹے چھوٹے مفید کتابچوں کا جو سلسلہ شروع کیا ہے یہ اس کی کڑی ہے۔ اس میں پروفیسر صاحب نے بڑی دیدہ وری سے کتابتِ حدیث کے بارے میں شواہد اکٹھے کیے ہیں اور اس ضمن میں منع کتابت والی حدیث پر بھی بحث کی ہے۔

(بقیہ اشارات)

قدرِ مشترک کی حیثیت نہیں رکھتی ان کی زبانیں ایک دوسرے سے الگ، ان کے اطوار ایک دوسرے سے جُدا، ان کے رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پھر یہ وسیع اختلاف دونوں بازوؤں تک ہی محدود نہیں بلکہ خود مغربی بازو جن علاقوں پر محیط ہے وہاں کے رہنے والوں میں بھی ماسوائے اسلام کی مقناطیسی قوت کے کوئی دوسری ایسی قوت موجود نہیں جو ان مائل بہ انتشار اجزا کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھ سکے۔ ان حالات میں اگر کوئی گروہ اسلام کے مقابلے میں علاقائی مفادات اور علاقائی تعصبات اُبھارنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ پاکستان کو مسمار کر دیتا ہے کیونکہ اسلام کے بغیر پاکستان کو کوئی دوسری قوت متحد نہیں رکھ سکتی۔

دنیا کی ساری اسلام دشمن طاقتیں پاکستان کی اس مخصوص صورتِ حال سے واقف ہیں۔ پھر انہیں اس بات کا بھی واضح شعور ہے کہ یہ ملک صرف اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا اور یہ اسلام کے دئیے ہوئے تصورِ قومیت کا عملی اظہار ہے اس لیے وہ شروع ہی سے اس کی مخالفت پر کمربستہ ہیں اور اسے برباد کرنے پر ادھار کھائے بیٹھی ہیں۔ اسے وہ خلافتِ عثمانیہ کی طرح اسلام کا آخری حصار تصوّر کرتی ہیں اور اس بات کا پختہ یقین رکھتی ہیں کہ اگر وہ اسے مسمار کرنے میں کامیاب ہو گئیں تو پھر ایک دو ممالک جو اُن کی یورش سے فی الحال بظاہر محفوظ دکھائی دیتے ہیں وہ بھی جلد ہی پیوندِ خاک ہو جائیں گے اور اس طرح ملّتِ اسلامیہ کا شیرازہ بالکل منتشر ہو کر رہ جائے گا۔ ان ناپاک مقاصد کی خاطر یہ طاقتیں شروع ہی سے اسلام کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف چلی آرہی ہیں۔ کہیں تو اسلام کے نام پر مغربی افکار و نظریات کو پروان چڑھانے کے لیے جدوجہد کی جا رہی ہے۔ کہیں معاشی عدل و انصاف کے پردے میں الحاد کا پرچار کیا جا رہا ہے اور کہیں مادی مفادات کے نام پر علاقائی تعصبات کو اُبھار کر پاکستان کے اندر چھوٹی چھوٹی قومیتوں کو جنم دیا جا رہا ہے۔ ان سب کا مقصد ایک ہی ہے کہ کسی طرح یہاں کے عوام اسلام سے برگشتہ ہو کر، جو ان کی قوت کا اصل سرچشمہ ہے، خود اپنی بربادی کا سامان فراہم کریں۔ مختلف علاقوں میں رہنے والوں کے درمیان ایک دوسرے سے عداوت اور نفرت کے

رجحانات اچانک تو پیدا نہیں ہوگئے بلکہ یہ سب کچھ ایک گے بندھے منصوبے کے تحت گذشتہ ۲۳ برس سے مسلسل کیا جا رہا ہے اور آج حالت یہاں تک پہنچی ہے کہ وہ قوم جس نے کبھی رنگ، وطن، نسل اور زبان کے بتوں کو پاش پاش کرکے صرف خدا پرستی کی بنیاد پر اپنی قومیت کا قصر تعمیر کیا تھا۔ آج اُن چھوٹے بتوں کی پرستش پر آمادہ نظر آتی ہے، وہ قوم جو کبھی دنیا کے سارے مسلمانوں کو ایک ہی رشتہ اخوت میں منسلک سمجھ کر اُن سب کے بارے میں بھائی چارے کے جذبات رکھتی تھی آج چھوٹے چھوٹے مفادات کی بنیاد پر مختلف قومیتوں میں بٹنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ اُسے مادی مفادات کی محبت نے زندگی کی اعلیٰ اور ارفع قدروں سے یکسر غافل کر دیا ہے اور ایک کلمہ گو مسلمان دوسرے کلمہ گو مسلمان کا محض اس وجہ سے گلا کاٹنے میں مصروف ہے کہ ان دونوں کا تعلق ملک کے دو مختلف خطوں سے ہے۔ اس اندوہناک صورتِ حال پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

ملک کو متحد رکھنے کے لیے اس وقت جو کوشش بھی کی جائے وہ قابلِ ستائش ہے کیونکہ اسلام دشمن طاقتیں تو منہ کھولے اس انتظار میں بیٹھی ہیں کہ کب یہ ملک پارہ پارہ ہو کر ان کے لیے تر نوالہ بن جائے تاکہ وہ اسے آسانی سے نگل سکیں۔ وہ پہلی منزل پر تو مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کرنا چاہتی ہیں کیونکہ اس منزل پر اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو اس ملک کے مزید حصے بخرے کرنے میں انہیں کوئی خاص دقت نہ ہوگی کیونکہ جن مادی مفادات اور جن رنجشوں اور دل کی جن کدورتوں کی بنا پر وہ ان دو بڑے خطوں کے مابین افتراق پیدا کریں گی ان کی بنیاد پر ہی وہ پھر مغربی پاکستان میں انتشار کے بیج بونے میں کامیاب ہوں گی۔ خدا سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دشمنوں کے ان منصوبوں کو ناکام بنائے اور اس ملک کی قیادت کو اخلاص اور عقل و تدبر عطا فرمائے اور عوام کو ان مصائب سے بچائے جن کا اس خلفشار کے نتیجے میں پیدا ہونا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہم اس ملک کے ہر دردمند شہری سے اس بات کی اپیل کرتے ہیں کہ وہ خدارا اس عظیم نصیحت کی صحیح قدر کو پہچاننے کی کوشش کرے جس کی وجہ سے ان کے اندر کسی پائیدار اتحاد کی بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے۔ اسلام کے بغیر پاکستان کا تصور خواب پریشاں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

رجسٹرڈ ایل نمبر : ۵۳۴۰ فون نمبر : ۵۲۵۰۷